Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1968

سچے موتی

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا۔ یا ان کے بال بچوں پر ویسے ہی فاقے کی نوبت آجاتی۔ تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے۔ اور پھر اس کے برابر حصے کر کے آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

(صحیحین)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

معراج انسانیت
پرویز

سیرت صاحب قرآن - خود قرآن کے آئینے میں

حسن سیرت کی رعنائیاں - خالق حسن کی نگاہ میں

- سیرت طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیث صحیحہ کی روشنی میں •
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے •
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب •
- دنیا بھر کے ارباب فکر و نظر کا خراج تحسین

• بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں •

ایک انقلاب انگیز تصنیف • ایک عہد آفریں کوشش • عشق و خرد کا حسین امتزاج •

بڑا سائز • ضخامت قریب پانچسو صفحات • کاغذ نہایت اعلیٰ • جلد مضبوط • گرد پوش جاذب نگاہ

• قیمت • بیس روپے • Rs. 20/-

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

مکتبہ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ـــــ پاکستان ـــــ دس روپے

سالانہ ـــــ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے

سالانہ ـــــ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ۱ ایکروپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلی فون

۸۰۰۸۰۰

خط و کتابت:

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد (۲۱) | نومبر ۱۹۶۸ء | نمبر (۱۱)

فہرست

۱۔ لمعات ـــــ ۲

۲۔ روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن ـــــ (محترم غلام صابر صاحب) ـــــ ۱۱

۳۔ انسانیت کا آخری سہارا ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۲۵

۴۔ عورت کی مظلومی ـــــ ۵۷

۵۔ طلاق اور خلع ـــــ (محترم ابوشہاب رفیع اللہ صاحب) ـــــ ۶۲

۶۔ نقد و نظر ـــــ ۷۰

۷۔ طلوعِ اسلام نے کیا کیا ہے؟ ـــــ (محترم حسن عباس رضوی صاحب) ـــــ ۷۴

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ پرنٹر: سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ: اشرف پریس، ایبک روڈ۔ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جماعتِ اسلامی کے پروپیگنڈہ کی تکنیک سادگی و پُرکاری کی بے نظیر ابلہ فریبانہ مثال ہوتی ہے۔ وہ ایسا سوال سامنے لاتے ہیں جو بادی النظر میں بڑا معصوم اور ناقابلِ اختلاف ہو۔ لیکن اس راکھ کے نیچے ایسی چنگاریاں دبی ہوں جو سینوں میں خلفشار و انتشار کی آگ بھڑکا دیں۔ اس کا تازہ شاہکار ترجمان القرآن کی اکتوبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت کے اشارات ہیں جن کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

> گزشتہ ماہ کے وسط میں، صدر مملکت نے ایک غیر ملکی مصنفہ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ "جس چیز سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں وہ قرآن کریم کا تبحر اور اس کی عظمت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس اور ان کی زندگی، کلامِ پاک میں ارشاداتِ خداوندی کے اتباع کا عملی نمونہ تھی۔ اور وہ خاتم المرسلین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ ہی کو اپنے ایمان کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔" صدر محترم کے بیان کا یہ حصہ بڑا ایمان افروز ہے اور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انہیں اسلام اور حضور سرورِ دو عالمؐ سے گہری محبت ہے۔ ہم اپنے ایک مسلمان بھائی کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں اور ان کی تصریحات کو محض الفاظ کی صناعی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے قلبی احساسات کی ترجمانی خیال کرتے ہیں۔ لیکن ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح، اسلام کے ساتھ آج کل جو بیت رہی ہے، جب ایک طرف اس کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور دوسری طرف صدر محترم کے ان خیالات کو سامنے لاتے ہیں تو عجیب سی الجھن اور وحشت محسوس ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس نے قریب اٹھارہ صفحات اسی موضوع کی نذر کئے ہیں، اور "ایک سیدھے سادے مسلمان" کی طرح اس سوال کو ابھارا ہے کہ جب صدر محترم کے دل میں کتاب و سنت کا اس قدر عمیق احترام ہے تو وہ ملک میں اسلامی نظام قائم، اور کتاب و سنت کے مطابق احکام نافذ کیوں نہیں کرتے؟ آپ سوچئے کہ کیا ملک میں کوئی ایک مسلمان

بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس سوال کی اہمیت سے انکار کرے اور صدر محترم سے اس سوال کا جواب سننے کے لئے مضطرب و بیقرار نہ ہو۔ غور کیجئے کہ یہ منطق کس قدر مسحور کن ہے کہ (۱) جب آپ کے دل میں کتاب و سنت کا اس قدر احترام ہے۔ (۲) آپ کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ تو (۳) پھر آپ ملک میں کتاب و سنت کے احکامات نافذ کیوں نہیں کرتے ؟ ــــ آیئے، ہم اس ساکت و ساکن سطحِ آب سے ذرا نیچے اتریں اور دیکھیں کہ وہاں کتنی کتنی بڑی چٹانیں کھڑی ہیں جن پر سے گزرتے ہوئے کوئی کشتی بھی سلامت نہیں رہ سکتی۔

سوال یہ کیا گیا ہے کہ ملک میں کتاب و سنت کے مطابق قوانین کیوں نہیں نافذ کئے جاتے ؟ "کتاب" کے متعلق تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے جو ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہوتا ہے اور جس کے ایک لفظ میں بھی کسی کو اختلاف نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس مرکب کے دوسرے جزو ــــ یعنی سنّت ــــ کی کیا پوزیشن ہے ؟ کیا یہ بھی کسی ایسی کتاب میں موجود ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک (قرآن مجید کی طرح) متفق علیہ ہے ؟ اس باب میں ہم مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نظریات کو بحث میں نہیں لانا چاہتے، حامیانِ سنت کے صرف دو گروہوں کے موقف کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو خود جماعت اسلامی کے سربراہ، مودودی صاحب ہیں، اور ان کے مدمقابل، جماعت اہل حدیث کے نمائندہ، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم)۔ ان دونوں میں مابہ النزاع موضوع یہ تھا کہ "سنت کسے کہتے ہیں"۔ یعنی یہ سوال تو بعد میں سامنے آئے گا کہ سنت کا ایسا مجموعہ ہے کہاں جس کے احکام ملک میں نافذ کئے جائیں۔ سب سے پہلے یہ متعین کیا جانا ضروری ہے کہ سنت کہتے کسے ہیں؟ مودودی صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق وامتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو ــــ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے۔ اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص

اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(رسائل و مسائل حصہ اول۔ ط۱ ۳۱۱؛ ۳۱۶)

وہ اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دین میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ (ایضاً۔ ۳۱۴)

اس سلسلہ میں ان کا ارشاد ہے کہ

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا امکان ہے۔ (ایضاً ۳۰۵)

"سنت" کے متعلق آپ نے مودودی صاحب کا نظریہ ملاحظہ کر لیا۔ اس نظریہ کے متعلق جماعت اہل حدیث کے نمائندہ مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) نے لکھا تھا۔

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ ص۱۱)

ہم جماعت اسلامی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ملک میں کون سی "سنت" کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں؟ مودودی صاحب کے نظریہ کی سنت کے مطابق یا جماعت اہل حدیث کے مسلک کی سنت کے مطابق؟ نیز یہ کہ اگر ملک میں نظریہ اہل حدیث کی سنت کے مطابق قوانین نافذ کر دیئے جائیں، تو کیا جماعت اسلامی انہیں صحیح اسلامی قوانین تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوگی؟

"سنت" (جماعت اہل حدیث کے نظریہ کے مطابق) احادیث ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور یا وہ احادیث سے مستنبط ہوتی ہے۔ اس لئے "سنت" کے متعلق صحیح تصور قائم کرنے کے لئے احادیث کے متعلق بھی ان دونوں گروہوں کا مسلک معلوم کرنا ضروری ہے۔ احادیث کے متعلق، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) فرماتے ہیں۔

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اسکے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا...... جو احادیث قواعد صحیحہ اور رواۃ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں' ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔ (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص۱۲)

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے...... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً ص۵۵)

اب اس کے مقابلہ میں مودودی صاحب کا نظریہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اپنی کتاب "رسائل و مسائل" (جلد اول) کے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں۔

احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں۔ جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو' انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔

بخاری کی احادیث کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ

یہ دعوےٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

آپ دیکھیے کہ جماعت اہل حدیث کے عقیدہ کے مطابق' بخاری کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے۔ اور اس سے ایک مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس' مودودی صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری کی بھی ہر حدیث کو بلا تنقید جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مودودی صاحب کے نزدیک اس تنقید کا معیار

کیلئے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ وہ اپنی کتاب "تفہیمات" حصہ اول ص ۳۲۲-۳۲۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے۔

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو، کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے ...... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ...... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک ضعیف، غریب، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

اب آپ مودودی صاحب کے اس معیارِ تنقید کے متعلق جماعت اہل حدیث کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے ــــ مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) لکھتے ہیں۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے، جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق۔ مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاءاللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔
>
> (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۴۳)

ہم جماعت اسلامی سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کس کے معیار کے مطابق صحیح احادیث ہوں گی جن کے احکام وہ ملک میں نافذ کرانا چاہتے ہیں؟ نیز یہ کہ اگر جماعت اہل حدیث کے نظریہ کو معیار قرار دے کر ملک میں قوانین نافذ کر دیئے جائیں تو کیا جماعت اسلامی انہیں صحیح اسلامی قوانین تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوگی؟ یا اگر مودودی صاحب کے نظریہ کے مطابق احادیث کے احکام نافذ کر دیئے جائیں تو اہل حدیث حضرات انہیں اسلامی احکام تسلیم کر لیں گے؟

اہل حدیث حضرات تو ایک طرف رہے، مودودی صاحب کے حدیث کے متعلق نظریات دیکھ کر تو مولانا ظفر احمد عثمانی،

صدر جمعیت علمائے اسلام پاکستان نے تحریر فرمایا تھا کہ

یہ شخص منکرِ حدیث ہے ۔ گمراہ اور مبتدع ہے ۔ جاہل اجہل ہے ۔ پاگل ہے ۔

(مقامِ حدیث ۔ جلد دوم ۔ ص ۔ ۱۹)

نظریہ سنت و حدیث کے اختلافات کے متعلق ہم نے صرف دو گروہوں کا ذکر کیا ہے ۔ اگر آپ (اہل سنت والجماعت میں سے) حنفی اور اہل حدیث ۔ اور خود حنفیوں میں سے دیوبندی اور بریلوی نقاطِ نگاہ کو سامنے لائیں تو آپ کو ان میں، اِن سے بھی بڑھ کر اختلافات نظر آئیں گے ۔ اور شیعہ اور سنی اختلافات کی تو نوعیت ہی بنیادی ہے ۔ اس سلسلہ میں مولانا امین احسن اصلاحی تحریر فرماتے ہیں ۔

آپ کو جو اس بات پر تعجب ہے کہ آخر واضح احادیث کی موجودگی میں وہ (شیعہ حضرات) کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں ۔ تو آپ کو یہ تعجب غالباً اس غلط فہمی کے سبب سے ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی جن کتابوں کو آپ مستند و معتبر مانتے ہیں یہ حضرات بھی ان کو مستند و معتبر مانتے ہیں ۔ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیجئے ۔ ان حضرات کی حدیث و فقہ، ہر چیز کے اپنے مجموعے ہیں جو ان کے اپنے خاص ذرائع سے نقل ہوتے ہیں ۔ یہ انہی کو مستند و معتبر مانتے ہیں ۔ ان مجموعوں کے حدیث کو یہ کوئی وزن نہیں دیتے جو ہمارے ہاں معتبر ہیں ۔

(میثاق بابت مئی ۱۹۶۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ ترجمان القرآن نے جو سوال اٹھایا تھا (کہ جب صدرِ مملکت کے دل میں قرآن کریم اور اسوۂ رسول اللہ کا اس قدر احترام ہے تو وہ ملک میں کتاب و سنت کے مطابق احکام کیوں نہیں نافذ فرماتے) وہ بظاہر کس قدر معصوم سا اور سادہ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت وہ کتنا پیچیدہ اور ناممکن العمل ہے ؟ یہ ہے پراپیگنڈہ کے فن کا کمال ! کیا فریقِ مقابل کو بدنام کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر حربہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ؟

———(٥)———

ترجمان القرآن کے زیرِ نظر "اشارات" میں آگے چل کر لکھا ہے ۔

صاحبِ صدر کی تصریحات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ قرآن کی ساری تعلیمات کو اور حضورِ سرورِ کائنات ؐ کے ارشادات کو قیامت تک کے لئے دین میں حجت سمجھتے ہیں اور اس میں کسی تغیر و تبدل یا تنسیخ و ترمیم کے قائل نہیں ۔ وہ جب یہ بات مانتے ہیں کہ قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اور حضورؐ خدا کے آخری نبی ہیں اور انہوں نے زندگی میں جو کچھ فرمایا یا کیا وہ خدا کے منشاء کا اظہار تھا تو اس سے یہ حقیقت خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ کتاب و سنت کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ قیامت تک

> واجب الاتباع ہے اور کوئی فرد یا گروہ یا ادارہ یا پوری نوعِ بشری مل کر بھی اس میں اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ صدرِ مملکت کا کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ موقف بالکل درست ہے۔ کیونکہ فرامینِ الٰہی اور احکامِ رسولؐ کے اندر کوئی شخص کسی ترمیم کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس ملک میں ان ناقابلِ تغیر تعلیمات کے بارے میں جو گمراہ کُن نظریات پھیلائے جا رہے ہیں اور قرآن و سنت کے احکام کو جس طرح وقتی اور ہنگامی ثابت کیا جا رہا ہے اُسے کوئی صاحبِ ایمان ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کر سکتا۔

اس میں کہا یہ گیا ہے کہ کتاب و سنت کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ قیامت تک واجب الاتباع ہے اور کوئی فرد یا گروہ یا ادارہ یا پوری نوعِ بشری مل کر بھی اس میں اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ اور جو لوگ ملک میں ایسے خیالات پھیلاتے ہیں، وہ گمراہ ہیں اور کوئی صاحبِ ایمان ان کے ان خیالات کو ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کر سکتا۔ بادی النظر میں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ترجمان القرآن کی یہ تنقید عمومی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کے اس تشریح کی زد بھی خود صدرِ مملکت کی ذات پر پڑتی ہے۔ کیونکہ ان کا نظریہ یہی ہے کہ قرآن کریم کے اصول تو ہمیشہ کیلئے غیر متبدل ہیں لیکن ان اصولوں کے تحت جو جزئیات مرتب کی جاتی ہیں ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔۔۔ لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہونگے کہ یہ خیالات کسی "گمراہ طبقہ" کے نہیں، خود مودودی صاحب کا بھی یہی نظریہ ہے۔ وہ اپنی کتاب تفہیمات، حصہ دوم (ص ۳۲۷ پر) تحریر فرماتے ہیں۔

> یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا، احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حِکَم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔۔۔۔۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضا یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور

اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔
اسی تفصیل کو ترجمان القرآن کی اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں (مولانا اصلاحی کے قلم سے) ان الفاظ میں سمٹایا گیا تھا

> قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات و ضروریات کے تحت بھرنا نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ہم پوچھتے ہیں جماعتِ اسلامی سے کہ اگر اس قسم کے نظریات ایسی گمراہی ہیں جسے کوئی صاحبِ ایمان ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا تو ان کا خود اپنے سربراہ (مودودی صاحب) کے متعلق کیا خیال ہے؟

———(۵)———

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ ترجمان القرآن نے لکھا ہے کہ جب صدرِ مملکت کے دل میں کتاب و سنت کا اس قدر احترام ہے تو وہ ملک میں کتاب و سنت کے مطابق قوانین کیوں نافذ نہیں کرتے؟ جو تصریحات سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آئی ہیں ان میں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ واقعہ یہ ہے کہ "سنت" کا کسی ایسی کتاب کی شکل میں موجود ہونا جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو، تو ایک طرف، سنت کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق بھی مختلف گروہوں میں اختلاف ہے اور خود مودودی صاحب کے مسلک کو دیگر علماء اور جماعتیں کفر تک سے تعبیر کرتی ہیں۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا صدرِ مملکت (یا کسی اور) کے لئے یہ ممکن بھی ہے کہ وہ "سنت" کے مطابق ایسے احکام نافذ کر سکے جنہیں ملک کے تمام مسلمان صحیح اسلامی احکام تسلیم کر لیں؟ یہاں ہوگا یہ کہ اگر ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ کر دیا جائے گا جسے جماعتِ اسلامی مطابقِ سنت نہیں سمجھتی تو وہ ملک بھر میں کہرام مچا دیں گے کہ مملکت غیر اسلامی قوانین نافذ کر رہی ہے۔ جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ ملک کا اقتدار علیٰ ان کے ہاتھوں میں ہو۔ اس لئے ان کی ٹیکنیک بڑی فریب انگیز ہے۔ یعنی

(۱) ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ملک میں کتاب و سنت کے مطابق قوانین نافذ ہونے چاہئیں — لیکن

(۲) کتاب و سنت کے مطابق صرف وہ قوانین تسلیم کئے جائیں گے جنہیں یہ جماعت کتاب و سنت کے مطابق قرار دے۔

(۳) جب تک ایسا نہیں ہوگا یہ برابر شور مچاتے جائیں گے کہ ملک میں غیر اسلامی قوانین نافذ ہو رہے ہیں

ہیں۔ اور

(۴) یہ حربہ موجودہ صدر مملکت ہی کو نہیں، ہر حکومت کو بدنام کرنے کے لئے بڑا ہی مؤثر ہے۔

ہم ان حضرات سے برسوں سے یہ التماس کرتے چلے آرہے ہیں کہ اگر ان کے دل میں اسلام کا ایسا ہی درد ہے تو وہ بجائے اس کے کہ ملک میں انتشار پیدا کریں، ایک ایسا مجموعہ قوانین مرتب کر دیں جسے ملک کے تمام مسلمان متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ لیکن انہوں نے نہ ایسا کیا ہے، نہ ہی وہ کبھی ایسا کریں گے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کا مجموعہ قوانین مرتب کرنا ممکن ہی نہیں ـــ لیکن وہ اس حربہ کو بطور پراپیگنڈہ برابر استعمال کرتے رہیں گے۔ یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں نے زور ڈال کر آئینِ پاکستان میں یہ ترمیم کرائی تھی کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا (اور معلوم ہے) کہ ایسا مجموعہ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکتا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک مطابق کتاب و سنت ہو۔ اس لئے ـــ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی ـــ اور جب "رادھا ناچے گی" نہیں تو حکومت کو بدنام کرنے کا موقعہ ہر وقت حاصل رہیگا ـــ دیکھا آپ نے ان کے پراپیگنڈہ کا کمال؟

ادارۂ طلوعِ اسلام کی تازہ پیشکش

منزل بہ منزل

- طلوعِ اسلام نہ کسی سیاسی پارٹی کا نام ہے نہ مذہبی فرقہ کا۔ یہ قرآنی فکر کے عام کرنے کی ایک تنظیمی کوشش ہے اسی کو تحریکِ طلوعِ اسلام کہا جاتا ہے
- یہ تحریک کن کن مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے، یہ داستان بڑی حقیقت کش اور بصیرت افروز ہے۔
- اس داستان میں ان تمام عناصر کا تذکرہ بھی سامنے آجاتا ہے جو مسلمانوں کے قرآنِ مجید تک آنے کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے اور آج بھی کھڑے ہیں۔
- قرآنی فکر کی تحریک ان موانعات کو کس طرح دور کرتی اور امت کو کیسے قرآنِ مجید کے قریب لاتی ہے۔
- اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کے سالانہ اجتماعات نے کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔
- اور ان اجتماعات میں اس تحریک کے بانی، پرویز صاحب نے اپنے انقلاب آفریں خطابات کے ذریعے قوم کو کیا پیغام دیا ہے

منزل بہ منزل اسی قافلۂ قرآنی کی جادہ پیمائی کی نہایت حسین و سادہ اور بے حد جاذبِ توجہ کشش داستان ہے جسے بڑے دلکش انداز میں مرتب اور پیش کیا گیا ہے۔

چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت دیدہ زیب طباعت اور رنگین سرورق سے مزین ہے۔

قیمت۔ چھ روپے فی جلد

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

رُوئیداد
طلوعِ اسلام کنونشن لاہور
(گیارہواں سالانہ اجتماع)
منعقدہ ۱۰ ار لغایت ۱۳ ار اکتوبر ۱۹۶۸ء

غلام صابر

پھر اِس انداز سے بہار آئی

روز وشب کے اس سلسلۂ ناتمام میں خوشگوار یادیں ہی زندگی کے لئے وجہ طمانیتِ قلب ہوا کرتی ہیں۔ اُن یادوں، میں کبھی پیکرِ خلوص و محبت کا خون شامل ہوتا ہے اور کبھی زندگی کی پُر خطر اور تاریک راہوں پر اُن کا عزمِ صمیم اور بلند حوصلگی کا دیوانہ وار رقص ــــ لیکن خون بہہ جانے کے بعد، تاریک راہوں کے خطرناک موڑ مڑ جانے کے بعد ــــ ایک راستہ جو سیدھا منزل کی طرف لے جاتا ہے ــــ اُس پر "زندگی" کو توازن و تناسب کے ساتھ، ایک معتدل اور نرم روی کے ساتھ سرگرمِ عمل رکھنا ــــ دشوار ترین مرحلہ ہوتا ہے ــــ اس مرحلے کے بعد منزلیں قریب آجاتی ہیں اور راہروانِ منزلِ شوق کے پروانوں کے لئے اس دشوار ترین مرحلے کی ساعتیں ــــ زندگی کی خوشگوار یادیں بن جایا کرتی ہیں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کے جادہ پیماؤں کا کاروانِ شوق منزل کی طرف رواں دواں ہے اور نصب العین کی چوکھٹ نزدیک محسوس ہو رہی ہے جو چند سال قبل ایک دھندلے موسم میں آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی۔

رات بارش ہوئی اور یک لخت موسمِ گرما، خنکی میں تبدیل ہوگیا۔ احباب کو فکر تھی کہ پچھلی دو راتوں کی

طرح اگر آج رات بھی بادل مائل بہ کرم رہا تو ہمارے کنونشن کے اجتماعات کا جوش و خروش ٹھنڈک اور بارش کے پانی کا شکار ہو جائے گا لیکن ـــ ایسا نہ ہوا۔

آج اکتوبر کی نو تاریخ ہے۔ کاشانۂ پرویز کی جانب شمعِ قرآنی کے پروانے ملک کے کونے کونے سے امڈتے آ رہے تھے۔ ان خلوص و محبت کے پیکرانِ عظیم کا پہلا قافلہ کراچی سے محترم محمد اسلام صاحب کی معیت میں آیا ـــ اس قافلہ میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ اور ان نوجوانوں کو دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ یہ ملت کے مقدر کے ستارے ماضی اور حال کے اندھیروں کو اپنے عزمِ بلند سے پُر نور فضا میں تبدیل کر دیں گے۔ کیونکہ اقوام و ملل کی تاریخ میں نوجوان نسل ہی مستقبل کی مالک ہوتی رہی ہے۔ یہ منظر دیدنی تھا جب یہ عاشقانِ پاک طینت' روح اور قلب کی یکجائی کے ساتھ، اجنبیت کی تمام حدود سے ماوراء ہو کر اپنے دوسرے ہمسفروں سے گلے مل رہے تھے ـــ یوں تو گلے ملنا ایک رسم ہی ہے لیکن جذب و کیف اور سرور و جانفزائی کے جذبات اِن گلے ملنے والوں کی عظمتوں اور ذہنوں کی رفعتوں کا احساس دلا رہے تھے۔ جن کی زندگیوں کے نصب العین کی پہلی سطر یہ ہو کر اس دنیا میں زندگی ـــ بنی نوعِ انسانی کے لئے گزار دو۔

کل' اِن پیکرانِ خلوص و محبت کی گیارہویں "بیٹھک" کی ابتداء ہونے والی ہے۔ ۱/۲۵ بی کے علاوہ ۲۳/بی اور ۲۴/بی کی کوٹھیوں کے مکینوں نے' اِن دیوانوں کی رہائش اور دیگر انتظامات کے لئے اپنے صحن کھلے چھوڑ دیئے۔ اس دورِ تنگ نگہی میں یہ کشادہ ظرفی ایک بلند قدر کے طور پر دلوں میں نمازتِ ایمانی پیدا کر رہی تھی۔

۸ بجے کے قریب' طعام گاہ کی طرف سے کھانے کے لئے آنے کی آواز آئی۔ کنونشن کی طعام گاہ' عتیبہ بن اشعر کی یاد تازہ کر دیتی ہے جس میں چھوٹے بڑے تمام دنیاوی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر ایک دسترخوان پر بھائیوں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ہر شخص کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ کھانے میں سبقت اس کا دوسرا بھائی کرے۔ یوں ان سب نے مل کر کنونشن میں پہلا کھانا کھایا۔

شام ہو رہی تھی اور سورج اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں تھا۔ اور شمعِ قرآنی کے پروانے شام ڈھلتے ساحلِ مراد میں داخل ہو رہے تھے۔ اور ان کے قافلہ ہائے شوق جوئے قرآنی کے ساحلوں پر بزم آراء ہو کر ایک فضائے نورانی پیدا کر رہے تھے۔ جب سارے آنیوالے آ گئے تو رات کے کھانے کی دعوت دی گئی۔ طعام گاہ کا حسنِ انتظام حسنِ ذوق کا آئینہ دار تھا۔ کھانے کے فوراً بعد پہلا اجلاس شائقانِ بزم شروع ہو گیا۔ رات کے ایک بجے یہ اجلاس ختم ہوا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء پہلا اجلاس (۹ بجے تا ۱۲ بجے)

اس دنیا میں چند نفوس' اپنی زندگیوں کے مقاصد کی ہم آہنگی اور یک رنگی کی وجہ سے جب کبھی مل بیٹھ کر

غور و تدبر کرتے ہیں، تو اس بات کا یقین ہو ہی جاتا ہے کہ اس محفلِ مشاورت میں ذہنوں کے چراغ سے فضائے نورانی یقیناً پیدا ہو کر رہے گی۔ اور انسان ایک دن ایسے معاشرے کا فرد بن جائے گا جس میں تمام اوصافِ حمیدہ محسوس اور منضبط شکل میں جلوہ باریاں کر رہے ہوں گے۔ ان تاریکیوں کو نورانیت میں بدلنے والے یہ جیالے افراد آج پہلی مرتبہ اپنے ضابطوں کے مطابق ۲/۲۵ بی گلبرگ کی عمارت کے سامنے کے وسیع و عریض سبزہ زار کے خوبصورت پنڈال میں (زیرِ صدارت عزیز قریشی صاحب) باہم مل کر بیٹھے۔ اور صاحبِ صدر نے ہی تلاوتِ قرآنِ کریم سے جذبِ دروں کو گرمایا۔

محترم خلیل صاحب نے ان جنوں پروردہ، برہنہ سر اور عزمِ بلند کے پیکروں کا استقبال کرتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ اور کہا کہ — ہم میں سے نہ کوئی میزبان ہے اور نہ مہمان۔ اور یہ صرف مقصدِ حیات کی ہم آہنگی کی وجہ سے ہے، یہ گھر آپ کا اپنا گھر ہے۔

محترم شیخ سراج الحق صاحب نے قرآنک ایجوکیشنل سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ پیش کی، جسے سنکر احباب میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ انہوں نے گوناگوں موانعات کی وجہ سے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس اسکیم کو شاید بند کرنا پڑے۔ 'رپورٹ' نے ان عاشقانِ پاک طینت کو جھنجھوڑا اور یہ شمع قرآنی کے بے لوث پروانے بے ساختہ متحرک ہوئے اور پھر ایثار و قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ "معاون کمیٹی برائے قرآنک اسکیم" چند سیانوں نے تشکیل دی اور اس فریضہ کو نبھانے کے لئے اپنا خونِ جگر پیش کرتے ہوئے عزم کیا کہ انشاءاللہ آئندہ سال یہ سلسلہ بند نہیں بلکہ شروع ہو جائے گا۔

محترم خلیل صاحب ناظم ادارہ نے سالانہ رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ یہ تحریک ایک نئے دور کی سحر کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہے۔ اور جہاں جہاں، جن حلقوں میں شمع قرآنی کے پروانے موجود ہیں، وہاں قرآن کی انقلاب آور آواز فردوسِ گوش بنتی جا رہی ہے۔ اور اس گذرگاہِ حیات پر ہماری شکستہ امنگوں اور کوہ پیما عزائم کی موجودہ رفتار سے کیف و مستی کا نشاط انگیز سماں پیدا ہو رہا ہے۔ ادارہ نے رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے، اس سال (آٹھ کتابیں) شائع کی ہیں لیکن مالی موانعات کی وجہ سے کئی ایک کتابیں شائع نہیں ہو سکیں۔

پرویز صاحب کے بیرونی دورے، درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ کا منصوبہ، شہر لاہور میں پبلک اجتماعات کے انتظامات، آپ ہی کی سعیِ پیہم کا نتیجہ ہیں۔ (تفصیل سالانہ رپورٹ میں شامل ہے)

بعد ازیں قرار دادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کوئی تحریک کے واحد آرگن 'طلوعِ اسلام' کی اشاعت بڑھانے کی تجویز پیش کر رہا تھا۔ کوئی اس آرگن کے سہ ماہی انگریزی ایڈیشن کے نکالنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ کسی نے مفکرِ قرآن کی تازہ ترین مایہ ناز تصنیف ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION کی اشاعت بڑھانے کی صدا بلند

کی۔ اور یہ صدا سب کو متاثر کر گئی۔ اور پھر ہر ایک نے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی اور قریباً ایک ہزار کتاب آناً فاناً "محفوظ" ہو گئی۔ ایک صاحب پرویز صاحب کے دوروں پر زور دے رہے تھے۔ اور فرما رہے تھے کہ ؎

نہیں اہلِ سخن کی لب کشائی فیض سے خالی
صدف کا جب دہن کھلتا ہے تب گوہر نکلتا ہے

لائل پور کے نمائندہ محترم نذیر حسین عارف، راولپنڈی کے عزیز قریشی صاحب اور کوئٹہ کے قدیر صاحب نے اپنے اپنے شہروں میں پرویز صاحب کے دورے کا پروگرام رکھا۔

(۱) نومبر ۶۷ء　　لائل پور کا دورہ
(۲) دسمبر ۶۸ء　　راولپنڈی کا دورہ
(۳) مارچ ۶۹ء　　لائل پور کا دورہ
(۴) جون ۶۹ء　　کوئٹہ کا دورہ

قرار دادوں کے ذریعے احباب اپنے عزائم کا اظہار کر رہے تھے کہ محترم خلیل صاحب نے ایک ایسی قرارداد پیش کی جو "قرار داد تعزیت" تھی۔ انہوں نے بتایا کہ آج جب ہم اپنے پُرجوش ساتھیوں کی ہمرکابی میں منزلوں کی طرف محوِ سفر ہیں، ہم میں سے ایک مخلص ہمسفر، ایک پُرجوش ساتھی (عطا محمد علوی) بچھڑ گیا ہے۔ اور سفرِ آخرت کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ احباب جو تازہ ولولوں سے فضا میں ارتعاش قرآنی پیدا کر رہے تھے ...... خاموش ہو گئے۔ اور وہ ارتعاش کم ہوتا چلا گیا۔ اور محترم ظفر احسن محمود صاحب نے اعلان کیا کہ ہمارا دوسرا اجلاس ۲ بجے بعد دوپہر منعقد ہو گا۔

———(۰)———

۱۰ اکتوبر۔ دوسرا اجلاس (۲½ بجے تا ۵ بجے شام)

یہ اجلاس محترم نذیر حسین عارف صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ سٹیج سیکرٹری محترم ظفر احسن محمود صاحب نے تلاوت کے لئے محترم حافظ محمد یونس صاحب کو پکارا۔ اس جواں سال ساتھی کی آواز کا سوز، قرآن کے مفہوم و معانی کو نکھار نکھار کر سامنے لا رہا تھا۔ اور فضا اس صدائے فرقانی سے راحتِ جاں بنی ہوئی تھی۔

محترم ظفر احسن محمود صاحب نے آغازِ سخن کرتے ہوئے کہا کہ پرویز صاحب اس پیرانہ سالی میں صبح صادق سے سورج چھپنے تک اپنے پیغام کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی شبانہ روز محنت، اس بات کا تقاضا

کرتی ہے کہ ہم اپنے اپنے شہر کے گلی گلی، کوچے کوچے اور ہر ایک دروازے پر جا کر اس پیغامِ حق کو پہنچائیں۔ اور اگر ہم نے اپنے سوزِ جگر سے کام لیا تو ایک دن آئے گا کہ ملک کے کونے کونے کی تاریکیاں، نورانی فضا میں تبدیل ہو کر جنت نشاں بن جائیں گی۔ ان کے بعد قرار داد کی شکل میں تجویز پیش کی گئی کہ بزموں کی رکنیت میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ اور حلقہ معاونین میں توسیع کرکے ـــ مرکز کو اطلاع دینی چاہیئے۔ عزیز قریشی صاحب نمائندہ بزم راولپنڈی نے کہا کہ یہ کوچۂ عشق ہے اور اس میں تن من دھن کی بازی لگانا شرط اولیں ہے۔ ان احباب کی گفتگو کا انداز افہام و تفہیم کی طرز پر اور نگاہوں کی کیفیت، اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ منزلیں خود بڑھ کر ان کے نقشِ قدم چوم لیں گی۔ ـــ بحث و تمحیص کا یہ سلسلہ کافی وقت لے چکا تھا اور پھر یہ خبر جانفزا کانوں نے سنی کہ آج شام (۶½ بجے) بزم کراچی کی طرف سے ایک ڈرامہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" دکھایا جائے گا۔ اور یہ اجلاس ختم ہو گیا۔

ـــــــــــ (٭) ـــــــــــ

۱۰ اکتوبر ڈرامہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" ۶½ بجے شام

دیدۂ بینا کے لئے دو زندگیوں میں فرق کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ایک ایسی زندگی جس کے سامنے ایک مقصد، ایک نصب العین اور ایک منزل ہوتی ہے، اور دوسری زندگی جس کا نہ کوئی مقصد، نہ منزل اور نہ ہی کوئی واضح پروگرام ـــ منزل اور مقصد کا تعین ہی اس کائنات میں "آوارہ" اور "راہی" کی تخصیص کرتا ہے ـــ آج ہمارے معاشرہ کی کلچرل سطح کی سرگرمیاں آوارگی کا احساس دلاتی ہیں۔ لیکن بزم طلوع اسلام کراچی کے پرعزم راہیوں کی پیش کش "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" نے ایسا مربوط احساس بخشا جو زندگی کے بے ربط عملی تجربات کے بعد میسر آتا ہے۔ شیطنت کے مختلف روپ، ابلیسیت کے مختلف حربے، محسوس شکل میں ہمارے سامنے اس انداز سے پیش کئے گئے جس کے نقوش تا دیر ذہنوں پر مرتسم رہیں گے۔ ڈرامہ ختم ہوا۔ محترم پرویز صاحب نے مسرت و انبساط کے جذبات کے ساتھ محترم اسلام صاحب کو گلے لگایا اور حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے کہ

> "جب انسان اپنے اندر یقین محکم پیدا کر لیتا ہے تو پھر یہ یقین بال و پرِ روح الامیں کی شکل میں خود ہی نمودار ہو جاتا ہے۔ آج بزم کراچی نے اپنے یقین سے قرآنی آواز کو چار دانگ عالم میں پھیلانے کے لئے نئی طرح کا بیج بویا ہے۔ انشاء اللہ یہ تخم صالح ثمر آور ہوگا۔ میں آپ کی بزم کو مستحقِ صد تبریک و تہنیت سمجھتا ہوں۔ اللہ آپ کو برکت دے"۔

پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اور پرویز صاحب بزم کراچی کے سٹال کا افتتاح کرنے کے لئے صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ بزم کراچی کا یہ سٹال اراکین بزم کی مقصد سے لگن کی ایک بے نظیر مثال تھا۔ اور بس

سٹال سے پرویز صاحب نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ "اللہ تعالیٰ آپ کی اس لگن اور مشق کو تیز تر کر دے"۔ دوسری بزموں کے نمائندے بھی اس سٹال کو دیکھ کر آئندہ کنونشن میں اس قسم کے سٹال لگانے کا تہیہ کر رہے تھے۔

پرویز صاحب اپنے مکان کی جانب ایک بلند منصب دوست کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے ایک آیت کی طرف اپنے دوست کی توجہ دلائی جسے روشنیوں سے منور کیا گیا تھا۔ "پرویز صاحب میں تو اس آیت کو پڑھ بھی نہیں سکتا کیونکہ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتی"۔ انہوں نے کہا۔ محترم پرویز صاحب مسکرائے اور انہیں اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے ۔۔۔ وہ آیت تھی۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔

———— (۰) ————

۱۱ر اکتوبر۔ تیسرا اجلاس۔ صبح ۹ بجے

اس اجلاس کا آغاز محترم حسن عباس رضوی صاحب کی زیرِ صدارت ہوا۔ محترم حافظ عبدالمجید صاحب کی تلاوتِ قرآنِ پاک کے بعد علامہ اقبالؒ کی غزل کا یہ مصرعہ ۔۔۔ لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی ۔۔۔ محترم خلیل صاحب نے شروع کیا۔ کلامِ اقبالؒ کی معنویت اور موصوف کی آواز کی شعلہ فشانی نے قلب و نظر کو متاثر کر دینے والی فضا پیدا کر دی۔

خان عبدالحکیم خان صاحب (مردان) کے مقالہ کا موضوع تھا ۔۔۔ "طلوعِ اسلام کے خلاف اعتراضات"۔ محترم خان صاحب کی آواز کی کھنک، لہجے کا ٹھہراؤ، اُن کے استدلال میں جامعیت پیدا کر رہا تھا۔ انہوں نے چند ذاتی تجربات کے حوالے سے مذہبی پیشوائیت کی چیرہ دستیوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ طبقہ "داخل فی الاسلام" اور "خارج از اسلام" کا فتویٰ دینا اپنی میراثِ ازلی سمجھتا ہے جس میں ذاتی منفعت اور ذاتی اثر و رسوخ کا زہر عام طور پر موجود ہوتا ہے۔ انہوں نے قربانی کا ذکر چھیڑا، انکارِ حدیث و اقرارِ حدیث کی کہانی سنائی، شفاعت کے مروجہ غیر قرآنی تصور کو اجتماعی تساہل پیدا کرنے کا موجب قرار دیا۔ ثواب کے غلط مفہوم کو سہل پسندی کی علامت بتایا۔ اور پھر ہمارے سوسائٹی کے ناسور یعنی "پیر پرستی" کا تذکرہ چھیڑا کہ طلوعِ اسلام اسے نہیں مانتا۔ اس لئے کافر ہے۔ خان صاحب نے اپنے عالمانہ استدلال کے بعد اپنی بات اس شعر پر ختم کی کہ ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

صبح کے دس بجے تھے۔ نغمۂ توحید کے طائرانِ چمن محوِ انتظار تھے اور محترم پرویز صاحب کا خطاب سننے کے لئے بیتاب۔ مفکرِ قرآن کے اس خطاب کا عنوان تھا ـــ "جہانِ دیگر" ـــ مفکرِ قرآن مسکراتے ہوئے اسٹیج پر آئے تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سامعین خاموش تھے اور سننے کے لئے ہمہ تن گوش کی کیفیت طاری ہو چکی تھی ـــ مفکرِ قرآن نے ابتدائے سخن کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس انداز سے بہار آئی　　　کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک　　　اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

"ہم نوایانِ زمزمۂ قرآنی و ہمرہانِ جادۂ فرقانی ـــ! عید ہمیشہ ایک سال کے بعد آتی ہے لیکن ہماری اس عید کو دیکھئے کہ سال کے بجائے گیارہ ماہ کے بعد ہی وجۂ تابانیٔ قلب و جگر اور باعث شادابیٔ فکر و نظر ہو رہی ہے۔" ـــ انہوں نے کہا کہ جب جذبِ صادق ہو تو منزلیں خود بڑھ کر قدم چوم لیتی ہیں۔ جب آپ حضرات میرے پاس نہیں ہوتے تو میری حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

خلوت میں رہی ہیں تیری باتیں
جلوت میں رہے تیرے فسانے

مفکرِ قرآن نے احساس دلایا کہ ہماری ۱۹۶۵ء کی سترہ روزہ جنگ نے ہمیں ایک قوم ہونے کا احساس بخشا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد ہمارا قومی اور اجتماعی کردار ایک ایسے انتقام کی کیفیت کا احساس دلا رہا ہے جیسے ہمیں سترہ روزہ جنگ کی روایت سے نفرت ہے۔" انہوں نے کہا کہ "دنیا میں انسانیت کا تنزل اور شیطنت کو عروج ہو رہا ہے۔ بُری اقدار سوسائٹی کا چلن بن رہی ہیں اور اس آگ نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ "جمہوری نظامِ مغرب" ہے جسے سب اقوام نے اپنا لیا ہے۔" اس نظامِ کہن کے بارے میں مفکرِ قرآن نے کئی اہم گوشوں کو اجاگر کیا اور کہا کہ

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس افراتفری اور نفسا نفسی کے دور میں انسانیت کی آخری امید کا مرکز "بارگاہِ قرآنی" ہے۔ اور انسانیت میں امن و امان کا ایک ہی واحد ذریعہ ہے۔ قرآن انسان کے جسم جسم کا ساتھی ہے۔

ہمارے رویے قوانین کا تعلق نہ قرآن سے ہے اور نہ رسالت مآبؐ کی تعلیم سے۔ انہوں نے اراکین سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرا مقام داعی کا نہیں بلکہ ایک مبلغ کا ہے لیکن یہ سمجھ رکھیئے کہ اگر بلندیٔ کردار اور سیرت میں رفعت پیدا نہیں ہوتی تو اس تحریک میں صرف وقت ضائع کرتا ہے۔

ہمارا مستقبل "علم" کے ساتھ "اخلاق" سے بھی عبارت ہے۔ زندگی کی خطرناک اور پیچ در پیچ راہوں سے گزرنے کے لئے ماتھے کی بصارت سے نہیں، چشمِ بصیرت سے راہِ زندگی کی تلاش کریں۔ اور یہی قرآنی تعلیم کا منتہا و مقصود ہے۔

میری زندگی کی آخری آرزو "قرآنی درسگاہ" کا قیام تھا۔ خارجی موانعات نے اگرچہ مجھے مایوس نہیں کیا تھا، لیکن

آپ کے سوزِ دروں نے میری ان خزاں زدہ آرزوؤں کو مبدل بہ بہار کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپنے تمام عزائم میں کامیاب نہ بھی ہوسکے تو کم از کم ہے

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائینگے ہم

مفکرِ قرآن نے جذباتِ انبساط و مسرت کے اپنے خیالات کو اس دعائیہ شعر پر ختم کیا کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مفکرِ قرآن کا خطاب ختم ہونے کے بعد ایک "قرار دادِ تعزیت" نے دلوں کو پھر وقفِ اضطراب کر دیا۔ یہ قرارداد محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ کے رفیقِ حیات خان حبیب اللہ خان) کے حادثۂ موت کی تھی۔ احباب اس خبر کو سن کر اور قرارداد کی تائید کرتے ہوئے ایک گہرا کرب محسوس کر رہے تھے۔ اور اس طرح یہ اجلاس ختم ہوا۔

(٠)

۱۱ اکتوبر۔ چوتھا کھلا اجلاس۔ ۲½ بجے بعد دوپہر

"ہندو کیا ہے؟"

لوگ جوق در جوق تا ملہ درت نمہ کنونشن کے پنڈال میں وقت سے پہلے آکر اپنی اپنی نشستیں سنبھال رہے تھے تاکہ آرام اور سکون سے اجلاس کی کارروائی سن سکیں۔ یہ کنونشن کا پہلا کھلا اجلاس تھا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی وسیع و عریض پنڈال اپنی تنگیٔ داماں کا گلا کرتا دکھائی دے رہا تھا اور لوگ محوِ انتظار تھے کہ یہ اجلاس شروع ہو۔ سٹیج سیکرٹری محترم ظفر احسن محمود صاحب نے ایک جانی پہچانی شخصیت خان بخت جمال خان کو صدارت کے لئے بلایا۔ تلاوتِ قرآنِ کریم محترم حافظ محمد یونس صاحب نے فرمائی اور محترم خلیل صاحب نے کلامِ اقبالؒ سے لوگوں کو گرما دیا۔ اور جب انہوں نے یہ شعر پڑھا کہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

تو کئی آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور کئی دلوں کی آہیں فضا میں منتشر ہو گئیں۔

کلامِ اقبالؒ نے دلوں میں گرمی پیدا کر دی۔ بعض آنکھوں کے آنسوؤں نے فضا میں نمی پیدا کی اور بہت سے حساس قلوب تڑپ تڑپ اٹھے۔ اس فضا میں محترم حسن عباس رضوی صاحب کو پکارا گیا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا۔ "طلوعِ اسلام نے کیا کیا ہے"۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اس انقلابی تحریک کے نمایاں اور

سفر و کارنامے سے نمایاں کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ طلوعِ اسلام نے کیا کیا ہے؟ کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ اس تحریک نے خمخانۂ حجاز کی ٹوٹی پھوٹی ٹھیکریوں کو اکٹھا کر کے ایک بکھری اور منتشر داستان کو یکجا کیا ہے اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار و رموز کو وا کیا ہے! ملت کے مرض کا علاج یہ ہے کہ قرآن کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ کہ

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

تحریک کے لٹریچر نے قوم کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونک دی ہے اور مسلمان تدبر و تفکر کے راہِ مستقیم پر جادہ پیما ہو گیا ہے۔ اور اب دین کی آواز بلند ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں ہم رنگ و ہم آہنگ ہیں نئی نسل تحریک کے اثرات سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو چکی ہے۔

اس مقالہ کے بعد محترم جناب بخت جمال خان صاحب نے اپنے صدارتی افتتاحیہ میں فرمایا کہ انگریز یا ہندو براہِ راست بہت کم وار کرتا تھا۔ وہ خود مسلمانوں کے اندر غدار طبقہ کو اپنی مفاد پرستی کا آلۂ کار بنا کر مسلمانوں کو شکست دینے کے درپے رہتا تھا۔ انہوں نے اس کی شہادت خود اپنی سابقہ سیاسی زندگی کے واقعات سے ہم پہنچائی —

خانصاحب کی پرجوش اور دلچسپ تقریر کے بعد شام ..... چار بجے مفکرِ قرآن کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ لبوں پہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسٹیج پر تشریف لائے۔ اس بار ان کے خطاب کا موضوع تھا ”ہندو کیا ہے؟“ — سامعین سراپا انتظار بنے ان کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھے۔ خطاب کی اہمیت کی وجہ سے ہر نفس ہیکلِ خاموشی بنا ہوا تھا — مفکرِ قرآن نے اس تاریخی جائزہ اور عبرت انگیز مرقع میں بتایا کہ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے جس کا نام چانکیہ تھا اور وہ اپنے آپ کو کوٹلیا کہتا تھا۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار — اس کی کتاب ارتھ شاستر میں آٹھ نمایاں اصول ہیں جو نہایت رذیل ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً پہلا اصول — حصولِ اقتدار یا ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔ یا دوسرا اصول — ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے وغیرہ۔ اس کے بعد گاندھی جی کا نام آتا ہے جو بقول حضرت قائد اعظم ایک چیستان تھا معمہ تھا۔ اور قول و فعل کا تضاد اس کی شخصیت کا جزوِ لاینفک تھا۔

تاریخی واقعات کی روشنی میں ہندو قوم کی اجتماعی ذہنیت کی نشاندہی بھی ہوتی رہی۔ اور پھر ستمبر ۱۹۶۵ء کا حملہ بھی اس ملک گیری کی ہوس رذیلہ کی زندہ مثال ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہندو قوم دن بدن تشدد پسند ہوتی جا رہی ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام ان کی زندگیوں کے نصب العین بن چکے ہیں۔ مسلمانوں کی ملی غیرت اور انسانی حمیت کو تشدد کے ذریعے ختم کیا جا رہا ہے۔ استبداد کے آہنی شکنجوں نے مسلمانوں کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دی ہیں۔

مفکرِ قرآن تاریخی حقائق پر سے ایک ایک کر کے نقاب اٹھا رہے تھے اور یہ گہری گہری فضا میں ایک

خاص ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ اور جب محترم پرویز صاحب نے کہا کہ "یہ ہے میرے نونہالو! ہندو دیوتا کے روپ کی ایک جھلک" تو فضا پر۔۔ سکوت طاری ہو گیا، نوجوانوں کے چہرے شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہے تھے۔ مفکرِ قرآن نے سترچون کی بات دہرائی اور بتایا کہ پاکستان اور ہندوستان میں آئیڈیالوجی کی جنگ ہے۔ اور ہمیں احتسابِ خویش سے کسی لمحے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ؎

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اور نظامِ معاشرہ کی قوانینِ خداوندی کے مطابق تشکیل ہی سے ہمیں احتسابِ خویش کے بہترین مواقع فراہم ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو خطرہ سے محفوظ رہنے کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔

(پرویز صاحب کا یہ خطاب طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائیگا)

—————(۰)—————

۱۱ اکتوبر　پانچواں کھلا اجلاس　۷ بجے شام

تخلیقِ کائنات

قرآنی برادری کے "ممتاز رکن" محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ایک جامع شخصیت کے حامل ہیں۔ فوج میں رہے تو ملٹری کراس کا امتیازی نشان حاصل کیا (سابقہ) تحریکِ خاکسار میں قبولیت اختیار کی تو باقی تحریک کے دستِ راست کی حیثیت سے ساتھ رہے۔ اپنے فن میں بلند پایہ شہرت کے مالک بنے اور قرآن کریم کی طرف آئے تو پرویز صاحب کے سالہا سال پر پھیلے ہوئے درس کا ایک ایک لفظ لوحِ قلب پر مرتسم کر لیا۔ سالِ گزشتہ کے کنونشن میں آپ نے ایک بڑا بصیرت افروز لیکچر دیا تھا جس کا موضوع تھا —— تخلیقِ انسانی، سائنس اور قرآن کی روشنی میں۔ —— امسال انہوں نے موضوع کو اور پھیلایا اور اس کا عنوان رکھا —— تخلیقِ کائنات، سائنس اور قرآن کی روشنی میں۔ اور اسے حسبِ سابق سلائیڈز کے ذریعے روشن کیا۔

موضوع کے اعتبار سے لیکچر بڑا فنی سا تھا اس لئے اسے نہایت خشک ہونا چاہیئے تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کا انداز ایسا شگفتہ ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے موضوع کو بھی بڑا جاذب اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ لیکچر کی علمی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ اس کی دلکشی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ لیکچر ۷ بجے شروع ہوا۔ نو بجے کے قریب کھانے کا وقفہ دیا گیا۔ اور اس کے بعد یہ رات کے بارہ بجے تک جاری رہا۔ اور مجمع میں سے کسی ایک شخص نے بھی اپنی نشست سے جنبش نہ کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس قسم کے برجستہ اور طویل لیکچر ضبطِ تحریر میں نہیں آ سکتے اس لئے قارئینِ طلوعِ اسلام اس کی افادیت میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کی تلافی کی ایک ہی شکل ہے اور

دہ یہ کہ آپ احباب آئندہ کنونشن میں خود شریک ہو کر ایسے لیکچرز سے استفادہ کریں۔ کنونشن کی یہ نشست بھی بڑی کامیاب تھی۔

(۰)

۱۲ اکتوبر۔ چھٹا اجلاس۔ صبح ۹ بجے

آج کے اجلاس کی صدارت محترم محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی نے فرمائی۔ تلاوت قرآن محترم حافظ عبدالمجید صاحب نے کی۔ اسٹیج سیکرٹری جناب ظفر حسن محمود صاحب نے اس اجلاس کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کہا کہ ہمیں آئندہ کے پروگرام کو ترتیب دینے کے لئے کچھ منصوبہ بندی سے کام لینا چاہیئے۔ اور اس پیغام قرآنی کو ہر طرف پھیلانے کے لئے حتی الوسع کوشش کرنی چاہیئے۔ اس عالمگیر نظام کی تحریک کے لئے قربانی دینا اپنی ذات کی نشو و نما کا سامان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

(اس اجلاس میں مختلف قرار دادیں ایوان نے پاس کیں جن کی تفصیل آئندہ اشاعت میں شائع ہو جائے گی)

(۰)

۱۲ اکتوبر۔ محفل مذاکرہ ۔ ۲ بجے بعد دوپہر

لیجیئے۔ اب سامنے آگیا کنونشن کا وہ پروگرام جس کا انتظار سال بھر سے لگا رہتا ہے ۔۔۔ یعنی دوپہر کو بزم مذاکرہ اور رات کو مجلس استفسارات ۔۔۔ دونوں پروگرام عشق و دلیری، ذکر و فکر، متانت و شگفتگی، سنجیدگی و شادابی کا حسین و جمیل امتزاج ۔۔۔ جہاں تک مذاکرہ کا تعلق ہے یہ اس حقیقت کا مظہر ہوتا ہے کہ قوم کا مستقبل اس کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ان کا ذوق یقین اور جوشش کردار ایک بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح امڈتا ہے اور مخالفت کی ہر تو سن کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ طلوع اسلام ان نونہالان ملت کے لئے ایسا پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جس پر سے یہ پوری آزادی سے اپنے قلبی احساسات اور فکری تاثرات کو قوم کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآنی حدود سے متجاوز نہ ہونے پائیں۔ اور چونکہ طلوع اسلام مرد اور عورت کی مساوات کی قرآنی تعلیم کا بھی علمبردار ہے اس لئے اس مذاکرہ میں قوم کی سلیم بیٹیوں کے دوش بدوش "طاہرہ بیٹیاں" بھی شریک محفل ہوتی ہیں۔ طلوع اسلام نے قرآنی فکر و بصیرت کے عام کرنے سے قوم کے نوجوان طبقہ میں کس قسم کی قلبی تبدیلی پیدا کر دی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کی محفلیں مخلوط ہوتی ہیں لیکن کیا مجال کہ کسی گوشے سے نگاہ کی جنبش تک بھی بھٹکنے پائے۔ یہ محفلیں وقار و

سنجیدگی اور ادب آموزی و متانت شعاری کا پُر کیف و پُر نور مرتع ہوتی ہیں۔ اور اس حقیقت کی صداقت کی زندہ شہادت کہ اگر قوم کے نوجوانوں کی صحیح تربیت کی جائے تو وہ کس طرح شرافت و نجابت کا پیکر بن جاتے ہیں۔ اس محفل کی اہمیت و نزاکت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض مفکرِ قرآن بہ نفسِ نفیس سرانجام دیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ "سلیم بیٹے" اور "طاہرہ بیٹیاں" جب ایسے مشفق باپ کے زیرِ عاطفت اسٹیج پر آتے ہیں تو ان میں اس قسم کی خود اعتمادی و خود سپردگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے مفکرِ قرآن نے اپنے تمہیدی تعارف میں ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ حسین و جمیل محفل، محترمہ بہن بلند اختر بیگم رضا علی صاحبہ کی زیرِ صدارت ۲½ بجے شروع ہوئی۔ نشست گاہ شروع ہی سے اپنی تنگیٔ داماں کی شکوہ سنج تھی حالانکہ اس میں قریب دو سو نشستوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ تلاوتِ قرآن کریم محترمہ بہن، ثریا عندلیب نے فرمائی۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

اس کے بعد محترم خلیل صاحب نے، علامہ اقبالؒ کی وہ نظم حسنِ ترنم سے پیش کی جس کا ایک مصرعہ خود مذاکرہ کا موضوع تھا۔ یعنی

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

مذاکرہ کا مطلع، نژادِ نو کے سب سے چھوٹے ترجمان۔ عزیزی محمد مسعود متعلم جماعت پنجم تھا۔ اور مقطع، (حسبِ سابق) صحنِ خانۂ پرویز کی دو بچیاں۔ نجمےٰ اور سلمیٰ۔ ان کے علاوہ شرکائے بزم محترم خالد اسلام، پرویز رحیم، اختر عباس سعید، غلام صابر (راقم الحروف)، سراج منیر، فرید الدین احمد۔ اور دوسری طرف محترمہ ثریا عندلیب، عفت خلیل، عارفی سلطانہ، مسرت چغتائی، سلمےٰ خلیل اور غزالہ خان۔ چونکہ اس مذاکرہ کے تمام مقالات، طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوں گے اس لئے ان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ بجز اس کے کہ مذاکرہ کے اختتام پر، ناظم ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے، عزیزی محمد مسعود کو کتاب "اسلامی معاشرت" بطور تحفہ دی گئی۔ جناب صدر مذاکرہ نے، عزیزات عارفی سلطانہ (کے برجستہ خطاب) اور سلمےٰ خلیل کے اصالِ مذاکرہ مقالہ پر، ایک ایک کتاب بطورِ اعترافِ تحسین پیش کی۔ اور محترمہ بیگم یوسف ضیاء صاحبہ نے عزیزات نجمےٰ و سلمےٰ کو پچیس پچیس روپے بطورِ انعام پیش کئے۔ یوں یہ حسین و سادہ و رنگین محفل، قریب آٹھ بجے شب ختم ہوئی

(۰)

۱۲ اکتوبر مجلسِ استفسارات نو بجے شب

ٹھیک نو بجے شب اس محفل کا آغاز ہوا جس کی طرح خود مفکرِ قرآن نے ڈالی تھی اور جو اس وقت تک بے نظیر چلی آرہی ہے۔ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ جو صاحب، جو سوال پوچھنا چاہیں، ایک چٹ پر لکھ کر بھیج دیں۔ مفکرِ قرآن اپنی بصیرت کے مطابق اس کا جواب دیں گے بشرطیکہ سوال زندگی کے عملی مسائل کے متعلق ہو، فرقہ وارانہ اختلافی مسائل اور ہنگامی سیاسیات یا شخصیات سے متعلق نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی پرویز صاحب نے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ نہ مجھے کسی قسم کا کوئی دعویٰ ہے نہ میں اپنے فہمِ قرآن کو حرفِ آخر سمجھتا ہوں۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں اور میں نے اس سرچشمۂ علم و حقائق کو اپنی بساط کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں آپ کے سوالات کے جوابات اپنی اسی قرآنی بصیرت کی رو سے دینے کی کوشش کروں گا۔ اگر آپ اپنے سوال کے جواب سے مطمئن ہو جائیں تو ہو المراد۔ اگر ایسا نہ ہو تو میں یہیں سامنے رہتا ہوں، آپ وقت لے کر مجھ سے مل کر (یا بذریعہ خط مجھ سے دریافت کر لیں) میں آپ کے اطمینان کی خاطر مزید وضاحت کی بھی کوشش کروں گا۔

اس اعلان کے بعد میز پر سوالات کا کس قدر انبار لگ جاتا ہے اور وہ کس قدر متنوع موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں، اس کا اندازہ شرکائے مجلس ہی لگا سکتے ہیں۔ لیکن گوناگوں سوالات کی اس قدر اضطراب انگیزیوں کے باوجود جواب دینے والے کی طرف سے جس "سکونِ گہر"[1] کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ اس کی خود اعتمادی، تبحرِ علمی، بلندیٔ فکر اور وسعتِ ظرف کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام خصوصیات کے علاوہ، اس مجلس کی نمایاں انفرادیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں یہ حقیقت جھلک کر سامنے آجاتی ہے کہ مبدارِ فطرت کی فیض گستری نے اس مفکر کو، وسعتِ علم اور رفعتِ فکر کے ساتھ کس قدر شگفتہ دستا واپ طبیعت عطا فرمائی ہے اور اس کے حسنِ مزاج کا معیار کس قدر نفیس و لطیف اور شستہ و پاکیزہ ہے۔ یوں نظر آتا تھا گویا مجمع کے ہزاروں سامعین کا دل ان کی مٹھی میں ہے۔ وہ جب چاہتے محفل کو زعفران زار بنا دیتے اور جب چاہتے ہر سرِ مژگاں ستارۂ سحری کی چمک پیدا کر دیتے۔ بارہ بجے شب تک یہ سلسلہ جاری رہا —— آپ غور کیجئے کہ تقریباً دو بجے دوپہر سے سامعین پنڈال میں بیٹھے تھے اور کھانے اور نماز کے مختصر سے وقفہ کو چھوڑ کر بارہ بجے شب تک وہ وہیں بیٹھے رہے، اور اس کے بعد جب اس کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلہ کو اور دراز کیا جائے۔

محفل میں آخری سوال ایسا تھا جس نے ہر آنکھ کو پُر نم کر دیا۔ کسی اہلِ درد نے لکھا تھا کہ

خدا آپ کو عمرِ نوحؑ عطا کرے، لیکن آپ بہر حال اب چراغِ سحری ہو رہے ہیں، آپ نے

---

[1] با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ! (اقبالؒ)

کیا اسے بھی سوچا ہے کہ آپ کے بعد کیا ہوگا ؟

آپ دیکھئے کہ وہ کون سا قلب تھا جو اس سوال پر وقفِ اضطراب اور وہ کونسی آنکھ تھی جو اس پر اشکبار نہ ہو گئی ہوگی لیکن دیکھئے کہ زندگی اور حرارت کے اس پیکر نے اس کا کیا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ

> بیشک میں ایک چراغِ سحری ہوں لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فطرت کا قانون ہے کہ ہر سحر کے بعد صبح کی نمود ہوتی ہے۔ اس لئے میرے بجھنے کے بعد تاریکی نہیں ہوگی، اُجالا ہوگا۔

اس جواب نے دلوں کی دنیا میں ایک نورانی جنت کی نمود کر دی جسے سنبھال کر شرکائے محفل رخصت ہوئے۔

ہمیں بصد معذرت کہنا پڑتا ہے کہ ان سوالات و جوابات کو بھی ضبطِ تحریر میں لانے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اس لئے قارئین طلوعِ اسلام اپنے بے حد و نہایت تقاضوں کے باوجود، اس کی افادیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

---(۰)---

۱۴ر اکتوبر۔ بروز اتوار۔ صبح ۹½ بجے

آخری کھلا اجلاس

یہ اجلاس محترم ڈاکٹر محمد حیات صاحب کی صدارت میں آغاز پذیر ہوا۔ تحریک کے نوجوان ساتھی محترم حافظ محمد یونس صاحب نے آیاتِ قرآنی سے ماحول فرقانی پیدا کیا ـــ ریڈیو پاکستان کے مشہور فنکار محترم عبدالشکور صاحب نے اس اجلاس میں خاص طور پر شرکت فرمائی اور کلامِ اقبالؒ سے فضا میں دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی آواز میں ایک سرور انگیز سماں پیدا کیا۔ پہلے انہوں نے حضرت علامہؒ کی یہ نظم پیش کی ؎

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اور اس کے بعد سامعین کے اصرار پر یہ دعا ـــ ؎

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

شعرِ اقبالؒ نے فضا کو اپنے ہم رنگ کیا ہی تھا کہ محترم محمد اسلام نمائندہ بزمِ کراچی کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ موضوع تھا ـــ "طلوعِ اسلام کیا کہتا ہے" ـــ محترم اسلام صاحب تحریکِ طلوعِ اسلام کے السابقون الاولون میں سے ہیں۔ اور بقول شخصے "مجسم دل"۔ انہوں نے اپنے پُر مغز مقالہ میں بتایا کہ انسانیت کی نشوونما کا واحد اور مکمل

(باقی صلا پر دیکھئے)

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۸۴/۶)

ہزار جانکاہ مشقتوں کے بعد ہی سہی لیکن انسان کو بالآخر اسی کی طرف آنا ہے!

انسانیت کا آخری سہارا

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ ۱۰-۱۱-۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء

(میں)

پرویز صاحب کا

آخری خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیّت کا آخری سہارا

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ اُو سجدہ گذاریم و مُرادے طلبیم

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

قرآنِ کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم کسی ایک فرد (یا جوڑے) کی داستان نہیں۔ وہ درحقیقت نوعِ انسان کی سمٹائی ہوئی تاریخ ہے جسے نہایت جاذب و دلکش تمثیل کے پیرایہ میں، بصیرت افروز و حقیقت کشا انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تمثیل میں آدم اور اس کی رفیقہ، انسان (مرد اور عورت) کے نمائندے ہیں۔ ملائکہ فطرت کی قوتیں ہیں جنہیں مسخر کر لینے کی صلاحیت انسان کو ودیعت کر دی گئی ہے۔ اور ابلیس اس کی مفاد پرستی کے بیباک جذبات ہیں جو خود اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شیطان اور ابلیس، ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ شیطان، انسانی جذبات کی شعلہ مزاجی کا مظہر ہے (کہ اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور ابلیس، اُس افسردگی اور مایوسی کا ترجمان ہے جو ہر اشتعال کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ (ابلیس کے بنیادی معنی مایوسی کے ہیں) منظر اس داستان کا وہ دور ہے جس میں پہلے پہل انسانی آبادی کی نمود ہوئی تھی۔ اس دور میں سامانِ زیست کی عام فراوانی تھی اور تمام انسان (جتنے کچھ بھی وہ تھے) ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے۔ (وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ ۱۰/۱۹)۔ ان میں کوئی تفریق و تقسیم نہیں تھی۔ کوئی باہمی مخاصمت اور منازعت نہیں تھی، کسی قسم کے جھگڑے اور قضیے نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ ابھی "میری اور تیری" کی تمیز سے ناآشنا تھے۔ وہ ایک ایسی جنت کی زندگی تھی جس میں کیفیت یہ تھی کہ ــــ

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵) جس کا جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اُس وقت ارض — یعنی ذریعہ پیداوار — کی حیثیت متاع کی تھی۔ (۲/۳۶) یعنی استعمال کی شئے جس سے ہر ضرورتمند فائدہ اٹھائے لیکن وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔ وہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ تھی۔ (۴۱/۱۰) یعنی تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰)۔ اُس وقت خدا کی بے مزد و معاوضہ عطا کردہ بخشائشوں پر نہ بند باندھے گئے تھے نہ چھاٹک کھڑے کئے گئے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ اس میں ہر انسان کو اس کا اطمینان حاصل تھا کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اسے نہ بھوک کا خوف ستا سکتا تھا، نہ پیاس کا، نہ لباس کے متعلق کسی قسم کی پریشانی ہو سکتی تھی، نہ سکونت کے متعلق۔ اُس زندگی میں انسان سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم سب ایک خاندان کے افراد ہو اس لئے تم ایک برادری بن کر رہنا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ (۲/۳۵) آپس میں مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں ان چیزوں کا پھٹ کر الگ الگ ہو جانا جو اصل کے اعتبار سے (شجر کی طرح) ایک ہوں۔

ابلیس کا وسوسہ

آدمؑ اس سکون و اطمینان اور اس وحدت و اشتراک کی زندگی بسر کر رہا تھا، کہ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ۔ (۲۰/۱۲۰) اس کے دل میں انفرادی مفاد پرستی کے سرکش جذبات نے انگڑائی لی اور اس کے کان میں یہ افسون پھونکا کہ تجھے دوسروں کی کیا پڑی ہے۔ تو اپنی اور اپنی اولاد کی پرورش کی فکر کر۔ اس وسوسۂ شیطانی اور افسونِ ابلیسی کا نتیجہ یہ تھا کہ آدمؑ کی وہ وحدت اور برادرانہ اشتراک کی زندگی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ کی کیفیت پیدا ہو گئی (۲۰/۱۲۳) یعنی باہمی عداوت اور معاندت کی کیفیت — اَلْعِدَاءُ اُس لکڑی کو کہتے ہیں جو کسی لکڑی کو پھاڑ کر اس کے دونوں حصوں کے درمیان (WEDGE) کے طور پر دے دی جاتی ہے کہ وہ آپس میں مل نہ سکیں۔ اس اَلْعِدَاءُ سے پہلے یہ برادری، خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ اور ایک خاندان دوسرے خاندان کا رقیب حریف بن گیا۔ جب انفرادی طور پر خاندانوں نے اپنے مفادات کو غیر محفوظ پایا تو چند خاندانوں نے مل کر قبیلے کی شکل اختیار کر لی۔ اب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے مدمقابل کھڑا ہو گیا۔ خود لفظ قبیلہ کے معنی ایک دوسرے کے مدمقابل کے ہیں۔ اس طرح انسان، اُس قدیم زندگی کو چھوڑ کر جسے عصرِ حاضر زمانۂ قبل از تمدن سے تعبیر کرتا ہے، دورِ تہذیب و تمدن میں داخل ہوا۔ جوں جوں یہ اس تہذیبی دور میں آگے بڑھتا گیا، اس کی یہ گروہ بندیاں شدت اختیار کرتی گئیں۔ تا آنکہ اس تقسیم نے قبائل کی جگہ اقوام (NATIONS) کی شکل اختیار کر لی۔ اسے انسان کی تمدنی زندگی کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔

فساد انگیزیاں

اُس تمثیل میں، فطرت کی قوتوں (ملائکہ) نے جب انسان کے انفرادی مفاد پرستی کے جذبہ اور اس سے پیدا شدہ "میری اور تیری" کی تفریق پر نگاہ ڈالی تو کہا تھا کہ اس کے ہیولیٰ میں یہ دبی ہوئی چنگاریاں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ یُفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) یہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ چنانچہ اُس اولین دور کے بعد انسانیت کی ساری تاریخ (بجز چند لمحات کے) خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں کا عبرت ناک مرقع اور جگر خراش داستان ہے، جس میں ایک فرد دوسرے فرد کے، ایک خاندان دوسرے خاندان کے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے، اور ایک قوم دوسری قوم کے سامنے خنجر بدست (اور اس کے ساتھ ہی کفن بدوش) کھڑی ہے۔ اور یہ سب کاہے کے لئے؟ — اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ۔ (۱۶/۹۲) — تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ سلب و نہب (EXPLOITATION) کر سکے اور اس طرح اس پر بالادست ہو جائے۔ قوموں کی اس باہمی مسابقت سے انسانیت کس جہنم سے گذر رہی ہے، اس کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ مفاد پرستیاں اُبھریں کیسے؟

زمین، ذریعہ پیداوار ہے، لیکن زمین کی کیفیت یہ ہے کہ — وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ۔ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ (۱۵/۲۱) — اس میں رزق کے خزانے مدفون ہیں، لیکن وہ خزانے ایک خاص اندازے اور پیمانے کے مطابق ہی باہر آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، زمین سے رزق حاصل کرنے کے لئے محنت درکار ہوتی ہے اور یہ رزق اس محنت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے — جتنی زیادہ محنت، اتنا ہی زیادہ حصولِ رزق۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کی مشترکہ مفاد کی زندگی کی جگہ انفرادی مفاد اندوزی نے لی تھی تو اس میں سب سے زیادہ خوشحال اسے ہونا چاہیئے تھا جو سب سے زیادہ محنت کرے۔ لیکن ابلیس، یعنی انسان کی عقلِ فریب کار نے، جو اس کے جذبات کی تسکین کے لئے اسباب و ذرائع تجویز کرتی اور اس کے ہر اقدام کے لئے وجہِ جواز (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی ہے، اس کے کان میں پھر افسون پھونکا، اور اس سے کہا کہ میں تمہیں ایسی تدبیر بتاتی ہوں جس سے محنت دوسرے کریں اور تم آرام سے بیٹھے،

فتنے کی بنیاد

سامانِ زیست سمیٹتے جاؤ۔ اس کے لئے اس نے ذرائع رزق پر ملکیت کا تصور دیا۔ اس تصور سے ہوس پرست انسان کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مختلف حیلہ جوئیوں، اور فریب انگیزیوں سے زمین پر لکیریں کھینچیں، اور ایک حد زمین کو اپنی ملکیت قرار دے کر دوسروں کو اس سے محروم کر دیا۔ جب ان محرومیوں کی ذریعہ رزق تک رسائی نہ رہی، تو وہ مجبور ہو گئے کہ وہ مالکانِ اراضی

کی مرضی کے مطابق محنت کریں اور ان کی دی ہوئی روٹی کھائیں۔ اس سے دنیا میں بیگار، یعنی غلامی کی لعنت کی بنیاد پڑی۔ اگر ایسا ہوتا کہ یہ محنت کش غلام، جس قدر کھاتے اس سے کم (یا اتنا ہی) پیدا کرتے، تو یہ نظام زندہ نہ رہ سکتا۔ لیکن جتنا انہیں دیا جاتا تھا وہ اس سے زیادہ کما کر دیتے تھے۔ اس سے اس نظام کو استحکام حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دن نوعِ انسان کی تاریخ میں سب سے زیادہ منحوس تھا جب ایک مزدور نے اپنے مالک کو اس سے زیادہ کما کر دیا جتنا وہ کھاتا تھا۔ اس سے اُس ابلیسی نظام کو استواری نصیب ہوتی جس میں محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی خاندانوں، قبیلوں اور قوموں کی تقسیم تمدنی، اور سیاسی نوعیت کی تھی۔ لیکن اگر آپ بنظرِ غور دیکھیں، تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجائے گی کہ بنیادی طور پر انسان، دو ہی طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ ایک طبقہ محنت کرنے والا، اور دوسرا طبقہ اُن کی محنت کی کمائی پر مترفانہ آسائش زندگی بسر کرنے والا۔ اس طبقہ کو قرآن، مترفین کہہ کر پکارتا، اور نوعِ انسان کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے۔

دو گروہ

آپ تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ اسلوب و انداز مختلف ہونگے، اسباب و ذرائع متباین ہوں گے، نقاب اور پیکر بھی متنوع ہوں گے۔ لیکن نوعِ انسان اصولی اور بنیادی طور پر انہی دو گروہوں میں منقسم دکھائی دے گی ـــ ایک گروہ محنت کشوں کا۔ دوسرا گروہ ان کی محنت کے ماحصل کو غصب کرنے والوں کا ـــ اس نظامِ معیشت و تمدن کی رُو سے، اصول یہ طے پایا کہ محنت کش کو صرف اتنا دیا جائے جس سے وہ محنت کر کے کما کر دینے کے قابل رہے۔ اس سے زائد اس کے پاس کچھ نہ پہنچنے پائے۔ اور غاصبین کے پاس ان کی ضروریات سے فاضل دولت (SURPLUS MONEY) جمع ہوتی رہے۔ یہ فاضلہ دولت، تمام فسادات کی جڑ ہے۔ اسی سے یہ طبقہ اقتدار حاصل کرتا ہے، اور اس اقتدار کی رُو سے، محنت کشوں کو ان کی پست سطح پر رکھنے پر مجبور کئے رکھتا ہے۔ آپ دیکھیں گے، کہ تاریخ انسانیت میں زمامِ اقتدار کبھی محنت کشوں کے ہاتھ میں نہیں آنے پائی۔ یہ ہمیشہ غاصبین کے قبضہ میں رہی ہے۔ اُس زمانہ میں جسے عصرِ حاضر، جہالت اور بربریت کا دور کہتا ہے، یہ اقتدار خالص طبعی قوت (PHYSICAL FORCE) کے بل بوتے پر قائم رکھا جاتا تھا۔ دورِ تہذیب میں اس قوت کو قانون

قانون بھی انہی کا آلۂ کار ہے

کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ جو قانون غاصبین محنت کا وضع اور نافذ کردہ ہوگا، وہ کس کے مفاد کا تحفظ کرے گا؟ یہ قانون، چوروں، قزاقوں، رہزنوں کو مجرم قرار دے گا (تاکہ ان غاصبین کی دولت محفوظ رہے۔ مزدور کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے کوئی چُرا کر لے جائے گا!) لیکن یہ قانون

ان لوگوں کو کبھی مجرم قرار نہیں دے گا جو دوسروں کی کمائی کو دن رات لوٹتے رہتے ہیں۔ یہ جرائم کے انسداد کے لئے تدابیر اختیار کرے گا۔ لیکن جرائم کے محرکات اور اسباب و علل کو ختم کرنے کے لئے کچھ نہیں کرے گا۔ — اس لئے کہ یہ محرکات و اسباب تو خود اس قانون ساز سرمایہ دار طبقہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں — اس نکتہ کی وضاحت اسلامی تاریخ کے اس واقعہ سے ہو سکے گی کہ ایک شخص کے ملازموں نے کسی کے کھیت سے غلہ چرا کر کھایا تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا دینے کے بجائے اُن کے آقا کو سزا دی کیونکہ وہ انہیں پیٹ بھر کر کھانے کے لئے نہیں دیتا تھا اور انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر غلہ چرا کر کھایا تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اُن کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ مبنی تھا قرآن کے اس اصول پر کہ اضطراری حالت میں بھوک مٹانے کی حد تک حرام کھانے کی بھی اجازت ہے۔ یہ تھا محرکاتِ جرائم کے انسداد کی طرف مؤثر اقدام — مستقل احتیاج پر مبنی احساسِ عدم تحفظ (FEELINGS OF INSECURITY)، طبقاتی تفاوت کے پیدا کردہ امتیازات سے معاشرہ کے خلاف جذبات انتقام و نفرت — قدم قدم پر مجروح ہونے والی انسانی خودی کا تخلیق کردہ احساسِ کمتری۔ اپنی مرضی اور اختیار کے بغیر غریبوں کے گھر میں جنم لینے کے گناہ بلکہ یوں سمجھئے کہ دنیا میں آجانے کے جرم کی پاداش میں عمر بھر سزا بھگتنے کے احساس سے نظامِ عدل و انصاف کے خلاف جذبات بغاوت — احترامِ آدمیت کی تمام راہیں بند ہو جانے سے خود زندگی سے بیزاری — یہ اور اسی قسم کے اور اسباب ہیں جو جرائم کے محرکات بنتے ہیں۔ دوسروں کی محنت کو غصب کرنے والا طبقہ ان محرکات کو روکنے کی تدبیر کس طرح کرے گا اور کیوں کرے گا؟ ایسا کرنے کے لئے انہیں سب سے پہلے اس نظام کو ختم کرنا ہو گا جس میں محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا حاصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے انہیں خود اپنے بامِ بلند سے نیچے اُتر کر سطحِ آدمیت پر آنا پڑے گا۔ اس کے لئے انہیں خود کما کر کھانا پڑیگا اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنی کمائی میں سے انہیں بھی دینا پڑے گا جو کسی وجہ سے کمانے کے قابل نہ رہیں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کریں گے؟ ان کی تو انتہائی کوشش یہی ہے گی کہ اُس نظام کی گرفت میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں جس میں محنت کش کو سر اٹھا کر چلنے کی جرأت ہی نہ پڑے۔ لہٰذا ان لوگوں کے وضع کردہ قانون کی رُو سے وحدت و مساوات انسانیہ کیسے پیدا ہو سکے گی؟ اور اس قسم کے قانون کے مطابق فیصلوں کو میزانِ انسانیت میں عدل کیسے قرار دیا جا سکے گا؟

لیکن ظاہر ہے کہ خالی دھاندلی اور دھونس سے اپنے ہی جیسے انسانوں کے اس قدر گروہ کثیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی گرفت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے کچھ اور حربوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پہلے دانشوروں کا گروہ آگے بڑھتا ہے۔ اور عقلی دلائل سے ان زیردستوں

فلسفہ کے دلائل کو مطمئن کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کے لئے وہی مقام مناسب اور معین مطابقِ فطرت ہے جس پر انہیں رکھا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ارسطو کے ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز میں ستر دلیلیں دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ٹیڑھے پاؤں کے لئے ٹیڑھا جوتا ہی مناسب ہوتا ہے۔ اگر آپ اُسے سیدھا جوتا پہنا دیں گے تو اس سے وہ دو قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ یہ کیا ہے؟ عقلِ فریب کار کی حیلہ تراشیاں جس سے وہ محض ایک غلط مثال (یا تشبیہ) سے پیدا کردہ تصور کو زندگی کی مستقل قدر بنا کر دکھا دیتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اس لئے معاشرہ میں ان کا مقام، ان کی صلاحیتوں کے مطابق متعین ہونا چاہیئے۔ اگر کم صلاحیت والے کو اونچا مقام دے دیا گیا تو وہ ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دینے کے مرادف ہوگا۔ یعنی ان غاصبین کا معاشرہ پہلے ایسا انتظام کرتا ہے جس سے زیردست طبقہ کی صلاحیتیں ابھرنے ہی نہ پائیں۔ اور اس کے بعد اس اختلافِ صلاحیت کو طبقاتی تقسیم کے لئے بطورِ دلیل پیش کر دیتا ہے۔ علم و حکمت کے ان اجارہ داروں سے کوئی پوچھے کہ اگر پیدائشی صلاحیتیں عمر بھر اپنی سطح پر جامد رہتی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو بلال حبشی، صہیب رومی، زید اور ان کے بیٹے اسامہ (رض) اور ان جیسے صدہا اور غلام، مزدور، محنت کش، جنہیں اُس زمانے کے معاشرہ نے ہر قسم کی صلاحیتوں سے عاری اور ذلیل ترین مخلوق قرار دے رکھا تھا، چند دنوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے کس طرح انسانی صلاحیتوں کے بلند ترین مظہر بن گئے تھے؟ اگر فطرت غلام کو پیدا ہی خدمت گذاری کے لئے کرتی ہے تو دنیا میں غلاموں نے سلطنتیں کس طرح قائم کر دکھائی تھیں؟

پھر یہی حکمتِ ابلیسی ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ مختلف قسم کے کام کرنے والوں کی ضروریات بھی مختلف ہوتی ہیں اس لئے ہر ایک کو یکساں نہیں ملنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات اس کی طبیعی زندگی کے تقاضے پورے کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک انجینئر کی طبیعی زندگی کے تقاضے، ایک مزدور کی زندگی سے مختلف ہوتے ہیں جو ان کے لئے سامانِ پرورش میں تفاوت بھی ناگزیر ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد کے ذمے جو کام لگایا جائے گا، اس کام کے سرانجام دینے کے لئے، مختلف آلات و ادوات کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ ان کی طبیعی ضروریات میں بھی فرق ہوگا۔ اگر ایک مزدور کو چائے کے ساتھ انڈے اور مکھن دے دیئے جائیں تو کیا اُن سے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگ جائے گا؟ اور اگر اس کے گھر میں بھی صوفہ سیٹ رکھ دیا جائے تو کیا اُسے اُس پر بیٹھنے سے سوئیاں چبھینگی؟ قرآن کریم نے جنت کے متعلق کہیں یہ نہیں کہا کہ اس میں کچھ لوگوں کو کھانے کو گوشت، پھل، دودھ، شہد

بیٹھنے کو صوفے اور قالین، اور پہننے کو حریر و اطلس ملیں گے اور دوسرے لوگوں کو دال روٹی دی جائیگی جسے وہ پھوس کی جھونپڑی میں زمین پر بیٹھ کر کھائیں گے۔ وہاں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں بتائی گئی۔ یہ جہنمی معاشرہ کا اسلوب و انداز ہے جس میں انسان اور انسان کی طبیعی ضروریات میں اس قدر تفاوت روا رکھا جاتا ہے۔ اور کام کی اُجرت، اس تفاوت کے پیشِ نظر متعین کی جاتی ہے۔ اسے (LIVING WAGE) کہا جاتا ہے۔

اُجرتوں کا تعین

یہ اجرتوں کا تعین بھی عزیزانِ من! عجیب گورکھ دھندا ہے۔ مزدور کی اجرت تین روپے روز ہوگی اور انجینیر کی تیس روپے یومیہ۔ سوال یہ ہے کہ اس تین روپے اور تیس روپے یومیہ اُجرت مقرر کرنے کا معیار اور اصول کیا ہے؟ یہ معیار طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا سوال ہے اور کیا؟ کارخانہ دار کو ایک ہزار مزدور اور ایک انجینیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ طبقہ انتظام ایسا کرتا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی مزدوروں کے سوا کچھ اور بن نہ سکے۔ لہٰذا اس جنس کی رسد (SUPPLY) طلب (DEMAND) سے زیادہ ہوتی ہے۔ بنا بریں مزدور کے لئے اس بات کے فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جو اجرت اسے پیش کی جاتی ہے وہ اُسے قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ اس قدر ضرورتمند ہوتا ہے کہ اسے جو اُجرت بھی میسر آجائے اُسے غنیمت سمجھتا اور آجر کا شکر گذار ہوتا ہے کہ اس نے اسے رزق مہیا کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ بڑی بڑی صنعتوں والے، ملک کے سر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اتنی کثیر آبادی کے لئے رزق فراہم کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔ یہ ہیں عقلِ فسوں ساز کے وہ حیلے جن سے وہ نوعِ انسان کی اس تقسیم و تفریق کی جڑیں مضبوط کئے رکھتی ہے۔

اسی عقلِ فسوں ساز نے انسان کو ایک اور مغالطہ بھی دے رکھا ہے اور یہ وہ مغالطہ ہے جسے آغازِ تاریخ سے اس وقت تک، مشرق و مغرب میں ہر جگہ، ایک مسلّمہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہی ایسی واقعہ ہوئی ہے کہ ذاتی ملکیت اور زیادہ سے زیادہ انفرادی نفع اندوزی کے علاوہ کوئی اور جذبہ محرکہ نہیں جو اسے زیادہ سے زیادہ کام پر آمادہ کر سکے۔ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا اگر اس نکتہ پر تفصیلی بحث کروں کہ انسان کی سرے سے کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت تو مجبور اشیاء کی ہوتی ہے ـــ جیسے آگ کی فطرت حرارت پہنچانا ہے ـــ اور انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی فطرت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا اور اپنے لئے آپ راہیں تراشتا ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح تصور کر لیا جائے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جس کام میں اسے ذاتی نفع نہ ہو، وہ اس کے لئے کوشش نہیں کرتا، تو آپ ایک حقیقت پر غور کیجئے۔ ہم تاریخ انسانیت میں

ان افراد کی تعریف کرتے ہیں، ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں، ان کے مجسمے نصب کرتے ہیں، انہیں نوع انسان کا محسن قرار دیتے ہیں جنہوں نے اپنے نفع کی خاطر نہیں بلکہ انسانیت کی فلاح وبہبود کی خاطر عمریں صرف کر دیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جو تاریخ انسانیت کے ممتاز ترین مقام پر فائز ہیں کیا یہ سب خلافِ فطرت زندگی بسر کرتے تھے؟ اگر انسان کی فطرت کوئی چیز ہے (جسے فطرت نہیں بلکہ شرفِ انسانیت کہنا چاہیئے) تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی ذات کے لئے نہیں عالمگیر انسانیت کے لئے جئے۔ صرف اپنے اور اپنی اولاد کے لئے جینا حیوانی سطحِ زندگی ہے۔ دوسروں کے لئے جینے والا انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ حیوان صرف اپنے لئے جیتا ہے، انسان دوسروں کے لئے جیتا ہے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ دوسرے انسانوں پر اپنی گرفت محکم رکھنے کے لئے انسانی عقل نے عجیب عجیب دلائل تراشے ہیں اور زبردست طبقہ کو قسم قسم کے حربوں سے اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن عزیزانِ من! عقل کی گرفت انسان کے دماغ پر ہوتی ہے دل پر نہیں۔ اور دماغ پر گرفت کے ہر وقت ڈھیلا پڑ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانیت کش نظام تنہا عقل کے زور پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اس

ارباب مذہب کی فریب دہی

کے لئے انسانی جذبات کو اپنے قابو میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ خدمت "مذہب" سرانجام دیتا ہے۔ (یاد رکھیئے! میری مراد خدا کی طرف سے عطا کردہ دین سے نہیں، انسانوں کے خودساختہ مذہب سے ہے۔) مذہب کبھی اس زبردست طبقہ کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کرتا ہے کہ ہر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ جنم کے اعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ اس اصول کے مطابق برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتا ہے۔ کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویش اس کے پیٹ کی اور شودر اس کے پاؤں کی تخلیق ہوتا ہے۔ یہ تقسیم خود برہما کی قائم کردہ ہے جس میں کوئی انسان رد و بدل نہیں کر سکتا۔ اس تقسیم کے خلاف لب تک حرف شکایت لانا تو ایک طرف، دل میں شکوہ سنج ہونا بھی انسان کو مہا پاپی بنا دیتا ہے اس لئے انسان کو اپنے مقام پر صابر وشاکر رہنا چاہیئے۔ کبھی وہ اس مظلوم ومقہور طبقہ کو اس فریب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ دنیا اور اس کی آسائشیں وہ دلدل ہیں جس میں پھنس کر انسانی روح کبھی خدا سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تمام لذائذ وحظائظ قابل نفرت ہیں۔ دولتمند لوگ اس دنیا کی چندروزہ زندگی آسائشوں میں گذار لیں۔ اس کے بعد یہ جہنم کی آگ میں جھلسائے جائیں گے۔ اور آسمان کی بادشاہت غریبوں کے حصے میں آئے گی۔ کبھی وہ انہیں اس عقیدہ میں مگن رکھتے ہیں کہ امیری اور غریبی، عزت اور ذلت پستی اور بلندی،

رزق کی تنگی اور فراوانی، سب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اسے ہر شخص کی پیدائش سے پہلے مقدر کر دیا گیا ہے۔ مقدر کا بدل دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیئے۔ رضی مولیٰ برہمہ اولیٰ۔ اس لئے تقدیر کے خلاف کسی کے لب پر حرفِ شکایت نہیں آنا چاہیئے۔ آپ غور کیجئے تو تقدیر کا عقیدہ، ہندوؤں کے ورنوں کے عقیدہ سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔ ورنوں کا عقیدہ خود ساختہ ہی سہی، لیکن اس کے لئے ایک منطقی دلیل تو دی جاتی ہے۔ یعنی اس میں شودر سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو اس پستی کی حالت میں پیدا کئے گئے ہو، تو یہ ایشور کی دھاندلی نہیں۔ تم نے کرم ہی ایسے کئے تھے جن کے نتیجہ میں تمہیں اس قسم کا جنم ملا۔ لیکن تقدیر کے لئے اتنی سی دلیل بھی نہیں دی جاتی، نہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ امیری اور غریبی، رزق کی بست وکشاد، پستی اور بلندی، سب اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے (معاذ اللہ) نہ کوئی قاعدہ ہے، نہ قانون۔ یہ یکسر اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس کے فیصلوں کے خلاف لب کشائی کرنا انسان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ یعنی اس میں انسانی سوچ اور فکر کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی جاتی — یہ ہیں مکڑی کے وہ جالے جن میں مذہبی پیشوائیت غریب انسانوں کو پھنسائے رکھتی ہے۔

وہ یہ کرتے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ ان کے لئے جاگیریں مقرر کرتا اور جائیدادیں وقف کر دیتا ہے چنانچہ محنت کر کے نہ یہ کھاتے ہیں اور نہ ہی ان کا سرپرست طبقہ — بلکہ جھونپڑیوں میں بسنے والا محنت کش اپنا خون پسینہ ایک کر کے ان سب کے محلات کی رنگینیوں کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہی کی محنت کی کمائی سے سرمایہ دار کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگ جاتے ہیں، اور مذہب کا مقدس اجارہ دار آگے بڑھ کر یہ فتوےٰ دے دیتا ہے کہ تم گھبراؤ نہیں جس قدر جی چاہے دولت اکٹھی کرتے، اور جائیدادیں کھڑی کرتے جاؤ۔ تمہیں ایسا کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

> جس طرح (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان اتنا تجارتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی، کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت یا شرکت کے

طریقہ پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین۔ از ابو الاعلیٰ مودودی صاحب۔ ص۳۲)

وہ اس قسم کے فتووں سے بالادست طبقہ کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ دولت خدا کی دین ہے۔ وہ جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں۔ گویا دولت آسمان سے اولوں کی طرح برستی ہے جسے بچے جھولیاں بھر بھر کر سمیٹ سکتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ دولت محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ ایک روپیہ جسے مترفین کا طبقہ بلا محنت اپنی تجوری میں ڈالتا ہے، مزدور کے سینکڑوں قطراتِ خون کا منجمد فشردہ ہوتا ہے۔ کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ یہ لوگ جانوروں کے خون کو تو حرام سمجھتے ہیں، لیکن انسانوں کے خون کو شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار دیتے ہیں۔

اقوامِ غالب کی حیثیت

یہاں تک میں نے، برادرانِ عزیز! تقسیمِ آدم کے اس حصے سے بحث کی ہے جو ایک قوم کے اندر وجہِ فسادِ آدمیت بنتا ہے۔ اب ہم 'قوم' کی حدود سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر جاتے ہیں۔ اس سطح پر اجمالی طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جو کچھ بالادست طبقہ، زیر دست طبقہ کے ساتھ ایک معاشرہ کے اندر کرتا ہے، وہی کچھ ایک 'بالادست قوم' زیر دست قوموں کے ساتھ کرتی ہے۔ ہمارے زمانے میں 'بالادست قومیں' صنعت میں ترقی یافتہ ہوتی ہیں' اس لئے انہیں ایک طرف ایسی قوموں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں خام مال سپلائی کریں اور دوسری طرف ان منڈیوں کی جہاں ان کا تیار کردہ مال فروخت ہو۔ اس مقصد کے لئے ان اقوام نے شروع میں' ان پس ماندہ اقوام پر اپنا سیاسی تسلط براہِ راست قائم کیا اور ان کے گھروں میں پہنچ کر چھاؤنیاں ڈال دیں۔ یہ دور 'استعماریت' (COLONISATION) کا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے' ان پسماندہ اقوام کی عادات اس قدر بگاڑ دیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ان اقوامِ غالب کی تیار کردہ مصنوعات کی محتاج ہو گئیں — تہذیب کی فریب کارانہ زبان میں یوں کہا جائے گا کہ انہوں نے ان کا معیارِ زیست بلند کر دیا — دوسری طرف انہیں اس قدر اپاہج بنا دیا کہ وہ اب' وہ کچھ بھی اپنے ہاں تیار نہ کر سکیں جو کچھ وہ اس سے پہلے اپنے ہاتھوں سے تیار کر لیا کرتی تھیں۔ ان قوموں کو اس حالت تک پہنچا کر وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلی گئیں اور میکیاولی سیاست کی زبان میں کہا گیا کہ انہوں نے انہیں آزادی عطا کر دی ہے اور یہ' ان اقوام ہی پر نہیں' عالمِ انسانیت پر ان کا احسانِ عظیم ہے۔ چونکہ ان میں کوئی قوم برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ان کی

منڈیوں میں کوئی دوسری قوم دخیل ہو سکے، اس لئے انہوں نے اِن منڈیوں کے اردگرد اپنے فوجی اڈے مستحکم کر لئے اور زیردست اقوام سے کہا کہ اس سے اُن کی حفاظت مقصود ہے۔ اس کے بعد اِن اقوام غالب نے، پسماندہ اقوام کو مزید "مہذب" بنانے کے لئے، ان کے ہاں اپنی بڑی بڑی مشینیں نصب کر دیں یہ مشینیں دی تو گئیں قرض پر لیکن تعبیر کیا گیا اسے "امداد" سے۔ ان مشینوں میں جو کچھ تیار ہوتا ہے، ان کے کیمیاوی اجزا (CHEMICALS) سب اُنہی اقوام غالب کے ہاں سے منگانے پڑتے ہیں۔ نیز اگر ان مشینوں کا ایک پیچ بھی ٹوٹ جائے تو جب تک وہ ان کے سرچشمہ ملک سے نہ آئے مشین بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس پروگرام کی رُو سے اِن اقوام کو سمجھایا گیا کہ وہ صنعتی ترقی کر رہی ہیں۔

پھر ان اقوام غالب نے بساطِ سیاست پر ایسے مہرے رکھے کہ یہ پست اقوام اپنی ہمسایہ اقوام سے ہمیشہ خائف رہیں اور اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے اسلحہ کی محتاج۔ یہ اسلحہ اپنی اقوام غالب کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ یہ قومیں ان پسماندہ اقوام کو، بلالحاظ اس امر کے کہ ان میں سے کس کی ضرورت جائز ہے، اس طرح اسلحہ فراہم کرتی ہیں کہ ان میں سے کبھی ایک کا پلڑہ جھک جائے کبھی دوسری کا اور اس طرح اُن میں قوت کا عدم توازن جاری رہے۔ اس طرح اِن اقوام کی آمدنی کا بیشتر حصہ، اسلحہ کی خرید کی نذر ہو جاتا ہے اور انہیں روٹی تک بھی مانگ کر کھانی پڑتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان قوموں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر

سکّہ کی دسیسہ کاریاں فسادِ آدمیت کے لئے یہی حربے کچھ کم نہ تھے کہ انسانوں میں بُعد و مغائرت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے، عقلِ انسانی کی دسیسہ کاری نے سکّہ (CURRENCY) کو بھی اپنا آلۂ کار بنایا۔ زمانہ قدیم میں زندگی کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بارٹر سسٹم (تبادلۂ اشیاء) کا رواج تھا۔ میرے پاس گندم ضرورت سے زاید ہے، آپ کے پاس شکر۔ میں نے آپ کو گندم دے دی اور اپنی ضرورت کے لئے شکر لے لی۔ اس سے ایک تو ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں اور دوسرے، دولت کسی ایک جگہ جمع نہیں ہونے پاتی تھی۔ غالتو جنس کا زیادہ ڈھیر جمع کر کے انسان کیا کرتا اور اسے کب تک محفوظ رکھ سکتا! جب آبادیاں وسیع ہوئیں تو انسان نے مبادلۂ اشیا کی سہولت کی غرض سے سکّہ ایجاد کیا۔ یہ بڑی مفید ایجاد تھی۔ لیکن جس طرح انسان کی ہوس پرستی نے دوسری مفید ایجادات کے غلط استعمال سے ان کی افادیت کو تباہی سے بدل دیا، یہی کچھ سکّے کے ساتھ ہوا۔ اس سے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے، دولت کا بے حد و حساب اکتناز شروع ہو گیا۔ اور جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، غالب اقوام نے تبادلۂ زر کے عیّارانہ

الٹ پھیر سے سکوں کی قیمتوں میں کچھ اس طرح کا تفاوت رکھا کہ پسماندہ اقوام کا روپیہ وہاں پہنچکر چار آنہ رہ جاتے۔ جہاں تک انسان اور انسان میں بُعد و مغائرت کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ لندن کے بھرے بازار میں کھڑے ہوں اور ایک ہزار پاکستانی روپیہ آپ کی جیب میں ہو لیکن آپ وہاں سے ایک آنہ کی روٹی خرید کر نہیں کھا سکتے۔ وہاں آپ بھی اجنبی ہیں، آپ کی کرنسی بھی اجنبی ہے۔ کچھ سمجھے آپ؟ آپ انسانوں کی بھری بستی میں تنہا ہیں۔ آپ خود اپنی جنس کے اندر کھڑے غیر ہیں۔ بیگانہ ہیں۔ اجنبی ہیں۔ آپ اِس زمین کے رہنے والے نہیں، کسی آسمانی کرّے سے ٹپک پڑے ہیں اور اس زمین کے رہنے والوں سے آپ کا کوئی رشتہ ناطہ، کوئی تعلق واسطہ، کوئی رابطہ ضابطہ نہیں۔ رنگ، نسل، وطن، زبان کا فرق تو پہلے ہی تھا، اب اس سکّے نے اس فہرست میں ایک اور کا اضافہ کیا — اور سخت اضافہ — کسقدر صحیح نقشہ کھینچا تھا اس ابلیسی معاشرہ کا قرآن نے جب کہا تھا کہ اِس میں انسان کی کیفیت یہ ہوگی کہ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ (۹۰/۱۵) وہ دوسرے انسانوں کے قریب ہوتے ہوتے بھی اپنے آپ کو تنہا پائے گا۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ مقام جس پر انسانیت اس وقت کھڑی ہے۔ اس سے یہ کرۂ ارض انسانوں کی بستی نہیں رہا، ایک ایسا مذبح بن چکا ہے جس میں جسدِ انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرا پڑا ہے۔ اور وہی نوعِ انسان جو کبھی ایک برادری تھی، اس کی کیفیت یہ ہے کہ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ۔ (۸۰/۳۴-۳۶) بھائی بھائی سے الگ ہے، بیٹا ماں باپ سے جدا، میاں بیوی سے اور بیوی میاں سے بیگانہ۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔ (۸۰/۳۷) ہر ایک، اپنی اپنی مصیبت میں اس طرح گرفتار کہ ایک کو دوسرے کی خبر تک نہیں۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
قیامت ہے کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری ہے

اقوامِ عالم کی باہمی آویزش

قومیتوں کی اس تفریق سے پیدا شدہ نفسانفسی اور افراتفری سے انسان کی حالت کیا ہو چکی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود ان اقوام سے پوچھئے جو ابھی کل تک نیشنلزم کو خدا کی رحمت قرار دیا کرتی تھیں۔ سنیئے کہ اب انہی اقوام کے مفکرین اس عفریت کے ہاتھوں کسقدر نالاں ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے

ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حق خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے، تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حق خود مختاری مانگتی ہوں۔ (صفحہ ۱۶۶)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے:۔

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ہی کی نہیں رہی۔ اس نے ایک مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں:

نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقت ور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح اور وحدت انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

(THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

اس نیشنلزم نے انسان اور انسان میں کس حد تک مغائرت پیدا کر رکھی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس وقت امریکہ کا شمار دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ پسماندہ ممالک کے لئے اس کی "امداد" نے (جس کی نقاب کشائی میں ابھی ابھی کر چکا ہوں) ساری دنیا میں اس کے جذبۂ ہمدردی نوع انسان کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ لیکن یہ اُس امریکہ کی بات ہے جو اس خطۂ زمین کے شمال میں واقع ہے۔ اُسی امریکہ سے ایک قدم کے فاصلے پر جنوبی امریکہ ہے۔ اس کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ان چند اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے جنہیں (FELIX GREEN) نے اپنی کتاب (A CURTAIN OF IGNORANCE) میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

لاطینی امریکہ کی بیس کروڑ آبادی کا دسواں حصہ بھی ایسا نہیں ہوگا جسے پیٹ بھر کر

کھانا نصیب ہو۔ راتیو ڈی جنیرو، بیونس آئرس اور میکسیکو جیسے چند شہروں کو چھوڑ کر
باقی علاقوں کی حالت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، غلاظت کے ڈھیروں پر پڑے
ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کے ماں باپ
بیس سینٹ روزانہ کی اجرت پر دن بھر محنت مشقت کرتے ہیں۔

خود اس ملک کے اندر طبقاتی تفریق کا یہ عالم ہے کہ ملک کی کل آمدنی کا آدھا حصہ حلقی کی آبادی کے دس فیصد حصہ کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے اور نصف آمدنی باقی نوّے فیصد آبادی کے حصہ میں آتی ہے۔ غلیاتن کی یہ حالت ہے کہ وہاں کی آبادی کے قریب ۷۰ فیصد حصہ کو بمشکل ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا ہے اور وہاں کے بچوں کی بیس سے چالیس فیصد تعداد، ایک سال کے اندر اندر مرجاتی ہے۔ یہ ہے اس امریکہ کے ہمسایہ ممالک کی حالت جس کی کشادہ ظرفی اور بنی نوع انسان کے لئے جذبۂ خیرسگالی کا ڈھنڈورا اس شدومد سے پیٹا جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا عزیزانِ من! کہ وہ جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ تم نے اشتراکِ باہمی کی زندگی کو چھوڑا تو تم ایک دوسرے کے دشمن بن جاؤ گے اور تم میں (WEDGES) حائل ہو جائینگی وہ کتنی بڑی حقیقت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس سے حالت یہ ہوگئی ہے کہ ؎

زیرِ گردوں آدم، آدم را خورد
ملتے بر ملتے دیگر چرد

انسان کی اپنی حالت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک قوائے فطرت کی تسخیر کا تعلق ہے، دنیا جس مقام پر گذشتہ پچاس سال میں پہنچ گئی ہے، اس سے پہلے کی چھ ہزار سال کی مجموعی ترقی اس کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن علم و ہنر کی اس قدر ثریا بوس رفعت اور حد و فراموش وسعت کے باوجود انسانوں کی اس عظیم بستی کی کیا حالت ہے۔ جسے زمین کہا جاتا ہے اس کے متعلق مشہور ماہر علم النفس، ڈاکٹر ینگ (JUNG) کا ایک فقرہ دہرا دینا کافی ہوگا جو اس نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

آج کرۂ ارض کی عظیم شاہراہوں پر ہر شے ویران، اداس، اور فرسودہ نظر آتی ہے۔

یہ بات اس نے ۱۹۳۱ء میں کہی تھی۔ اگر ینگ آج زندہ ہوتا تو ان شاہراہوں کی موجودہ ویرانیوں کو دیکھ کر معلوم کیا کہتا۔ وہی کچھ کہتا جو چند سال اُدھر امریکہ کے دو صحافیوں نے اپنے ملک کی تمدنی اور معاشرتی

حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا، وہ ان کی کتاب کا ٹائیٹل پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ کتاب تھی اہلِ امریکہ کے متعلق اور اس کا ٹائیٹل تھا۔

THE LONELY CROWD.

برادرانِ عزیز! کیا انسانی معاشرہ کی اس سے زیادہ عبرت انگیز تصویر کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسا ہجوم ہے جس میں ہر فرد اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اور پھر انسان کی بے بسی کا عالم یہ کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن اس جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس وقت دنیا کا حساس طبقہ اپنی موجودہ حالت کی وجہ سے سخت مضطرب و بیقرار ہے۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ دنیا ایک اور دنیا میں بدل جائے۔ اس دنیا کا کس قسم کا نقشہ اس کے ذہن

انسان کس قسم کی دنیا چاہتا ہے؟

(یا یوں کہئے کہ اُن کے خوابوں) میں آتا ہے اس کے متعلق خود اُنہی کے الفاظ میں سنیئے۔ کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ اُسقف (TEILHARD - DE - CHARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب "تعمیرِ ارض" (BUILDING THE EARTH) میں لکھتا ہے:-

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کریں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے اچھال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے وحدتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے

کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسان کو اپنے آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب (THE COMMUNITY OF MAN.) میں لکھتا ہے کہ :-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اُسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

مشہور امریکی مفکر (LEWIS MUMFORD) لکھتا ہے کہ "تہذیب درحقیقت اس عمل پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے۔" وہ آگے چل کر کہتا ہے۔

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا مغربی اندازِ معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بُری طرح ناکام ثابت ہوا ہے۔

.... اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اُس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اس کی نشوونما کے راستے میں بُری طرح حائل ہو رہی ہیں ۔۔۔ اس بطلِ جلیل کی ضرورت جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔ (TRANSFORMATION OF MAN.)

جولین ہکسلے کہتا ہے کہ دنیا کی موجودہ مختلف حکومتوں کی جگہ ایک عالمگیر واحد حکومت کا قیام نوعِ انسان کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔ اس عالمگیر وحدتِ انسانیہ اور وحدتِ نظامِ حکومت کے تحت جو نئی دنیا وجود میں آئیگی وہ کس قسم کی ہوگی، اس کا نقشہ سویڈن کا ماہر معاشیات (GUNNER MYRDAL) ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان ہر مقام پر خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے کام اور اندازِ زیست کا انتخاب کرے گا۔ اور اس میں معاوضہ اس محنت کا ملے گا جس سے کچھ تخلیق ہو، اور یہ معاوضہ نسل اور کلچر کی تمیز کے بغیر سب کے لئے یکساں ہوگا۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں

---

۱ (ON LIVING IN A REVOLUTION.)

سرمایہ اور محنت انسانی ضرورتوں کے مطابق اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوتا رہے گا۔ اور اس میں دنیا کے تمام ممالک اور تمام افراد کو ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہونگے جب تک دنیا کی یہ حالت رہے گی کہ اس کی نصف آبادی دولت مند اور باقی نصف مفلس ہے، کوئی عالمگیر معاشی نظام وجود میں نہیں آسکیگا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ صاحب سویڈن کے ماہر معاشیات ہیں اور سویڈن وہ ملک ہے جہاں کی فلاحی مملکت دنیا میں سب سے آگے سمجھی جاتی ہے۔ اس فلاحی مملکت کے ماہر معاشیات نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے (BEYOND THE WELFARE STATE)۔ یعنی اس ماہر معاشیات کے نزدیک، فلاحی مملکت بھی نوعِ انسان کے اس بنیادی مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل اس سے بھی کہیں آگے جاکر ملیگا۔ آگے چل کر یہ مصنف لکھتا ہے:۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکینگے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں، اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

"انسانی روح کے مذہبی نشیمن" میں اس قسم کی حسین دنیا کا تصور تو اب عام طور پر کیا جانے لگا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ حسین خواب محسوس تعبیر کا پیکر کس طرح اختیار کرے۔ جہاں تک مختلف مذاہب کا تعلق ہے، دُنیا ان سے مایوس ہو چکی ہے۔ کس حد تک مایوس، اس کے متعلق پروفیسر (WILLIAM - ERNST HOCKING) اپنی کتاب (LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH) میں لکھتا ہے۔

یہ تمام مذاہب ٹوٹی پھوٹی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے)۔ یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے)

ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر نہیں آسکتی) ان کے عقاید و نظریات کے رنگ نے ان کے (افکار و عمل کے) قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں کے تصور سے اس قدر ڈرے اور سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

مذہب کیسا ہو؟ دنیا کا انسان ان مذاہب سے مایوس ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی مشکلات کے حل کے لئے دروازہ پھر مذہب ہی کا کھٹکھٹاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (لارڈ MORLEY کے الفاظ میں) یہ حل ایسا مذہب پیش کرے گا

جس کی دعوت تمام نوع انسان کے لئے ہو

(ERICH FROMM) کا خیال ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہو گی جو

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہو گی کہ وہ عالمگیر ہو گا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مجموعہ ہو گا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابل عمل ضابطہ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنائے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ نوع انسان کا مذہب بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY)

ممفورڈ کا خیال ہے کہ اس قسم کا مذہب (حضرت) عیسےٰؑ اور (حضرت) محمدؐ جیسی شخصیتیں دے سکتی ہیں۔ وہ شخصیتیں کہ زمانے کا بحران ان کی تخلیقی نگاہ کو ایک عظیم انقلاب سے ہم آہنگ کر دے اور وہ اس قابل ہوں کہ نوع انسان کی صفوں میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کر سکیں۔

(THE TRANSFORMATION OF MAN)

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ عصر حاضر کا خود گزیدہ انسان، اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے کس مقام پر پہنچا ہے اور اس کی نگہ تجسس اسے کس چشمۂ زندگی کا سراغ دے رہی ہے۔ نوع انسان کی موجودہ

مرگ آفریں زندگی کو حیاتِ جاوید میں بدلنے والا انقلاب' یقیناً عیسٰےؑ اور محمدؐ جیسی ہستیاں ہی برپا کر سکتی ہیں۔ لیکن دنیا میں اس وقت نہ تو خود (حضرت) عیسٰےؑ موجود ہیں اور نہ ہی (حضرت) محمدؐ۔ اس لئے انسان کو لامحالہ ان کے دیئے ہوئے پیغام ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جہاں تک حضرت عیسٰےؑ کا تعلق ہے ان کا لایا ہوا پیغام اس وقت اپنی اصلی شکل میں دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اور جس پیغام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس سے انسان پہلے ہی مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق (مثلاً) جرمن ہیومنسٹ فلاسفر (GERHARD SZCZESNY) لکھتا ہے۔

> عیسائیت صحرا نوردوں کا مذہب بن سکتی ہے۔ بنیادی طور پر اس کا پیغام ثنویت (DUALISM) کی تعلیم دیتا ہے۔ جو فلسفہ اور سائنس کا ساتھ دے ہی نہیں سکتی۔ دو ہزار سال سے اس نے علم اور سائنس کی گاڑی کو بریک لگا رکھی ہے۔
>
> (THE FUTURE OF UNBELIEF)

پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:۔

> عیسائیت کی رو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقی دنیا بعد کی دنیا ہے۔ اس کے برعکس یہ دنیا شر اور فساد کی دنیا ہے۔ اس میں کوئی شے بالکل خیر اور طیب نہیں[1]

مشہور مفکر پروفیسر ولیم ہیڈ لکھتا ہے۔

> انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اگر اسے موجودہ زمانے میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا[2]

اس تجزیہ کے بعد ہمارے سامنے عزیزانِ من! صرف (حضرت) محمدؐ کا لایا ہوا پیغام رہ جاتا ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ جس وحدتِ انسانیت کے لئے اس وقت دنیا کے مفکرین اس قدر مضطرب و بیقرار ہیں اور انسانی معاشرہ کا جو نقشہ وہ اپنے خوابوں میں دیکھ رہے ہیں' محمدؐ کا لایا ہوا پیغام' ان کی ان حسین آرزوؤں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے یا نہیں۔ اور اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کے حصول و قیام

---

[1] (GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

[2] (ADVENTURE OF IDEAS.)

کے لئے کوئی ممکن العمل پروگرام بھی دیتا ہے یا یونہی نظری تصورات ہی پیش کر دیتا ہے۔ یہ مقام خاص توجہ کا مستحق ہے۔ میں اس سلسلہ میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پیغام کو میں اس لئے پیش نہیں کر رہا کہ میں خود اس کی صداقت اور محکمیت کا قائل ہوں۔ میں اسے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ (جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا) حالات کے تجزیہ نے ہمیں خود اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں ہمیں اس پیغام پر غور و فکر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ یہ میری پیشکش نہیں، دنیا کے مفکرین کا بیتابانہ مطالبہ ہے جسے پورا کرنے کے لئے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ اسے بے کم و کاست، اور بلا تبصرہ و تقریظ ان کے سامنے پیش کر دوں اور یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دوں کہ اس پیغام میں دنیا کی مشکلات کا حل موجود ہے یا نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قرآن کا پیش کردہ نظام

قرآن کریم نے قصۂ آدم کے سلسلہ میں جہاں کہا تھا کہ تم نے جو انفرادی مفاد پرستی کی زندگی اختیار کی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں پھوٹ پڑ جائے گی اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاؤ گے۔ تو اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا انسان کی حالت ابدی ہوگی؟ کیا وہ اس نفسا نفسی کی قیامت خیزی اور تشتت و انتشار کے جہنم سے کبھی نکل نہیں سکے گا؟ عیسائیت نے ہبوطِ آدم (FALL) سے یہی عقیدہ پیدا کیا تھا کہ انسان اس پستی سے اپنی سعی و کاوش سے نکل ہی نہیں سکے گا۔ وہ ابدی طور پر راندۂ درگاہ ہو گیا۔ لیکن قرآن نے کہا کہ نہیں۔ ایسا نہیں۔ ابدی مایوسی شرفِ انسانیت کے منافی ہے۔ انسان پھر سے اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پا سکتا ہے۔ اس کے لئے خود خدا اس کی مدد کرے گا۔ اسے اس کی طرف سے راہنمائی ملے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) جو کوئی اس راہ نمائی کا اتباع کرے گا تو اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ یہ راہ نمائی رسولوں کے ذریعے بھیجی گئی۔ رسولوں کی بعثت سے مقصد کیا تھا؟ غور سے سنیئے کہ قرآن کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ۔ (۲/۲۱۳) چونکہ مقصود یہ تھا کہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری بن کر رہے اس لئے خدا نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ وہ لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر انہوں نے انفرادی مفاد پرستی کی روش کو نہ چھوڑا تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ اور اگر وہ ایک برادری کی حیثیت سے رہے، تو وہ خوشگواریوں کے جھولے جھولیں گے۔ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ اور ان کے ساتھ ضوابط و قوانین بھی بھیجے جاتے رہے تاکہ ان کی رو سے ان

امور کے حق و انصاف کے ساتھ فیصلے کئے جا سکیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان میں گروہ بندیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تمام انبیاء کرام کی دعوت یہی تھی اور سب کا مقصود و منتہیٰ یہی۔ لیکن عہد قدیم میں چونکہ وسائلِ رسل و رسائل اور سامانِ مواصلات بہت محدود ہوتے تھے اس لئے ان حضرات کی دعوت ان کے علاقوں کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی تھی اور تمام نوعِ انسان کو امتِ واحدہ بنانے کا پروگرام عالمگیر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے حیطۂ اثر کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو خاندان، قبیلہ، نسل کے امتیازات سے بلند کر کے، خالص انسانیت کی بنیادوں پر ایک مشترک برادری کی تشکیل کرتے تھے جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے وہ ایک برادری کے افراد بن جاتے تھے۔ جو اس کی مخالفت کر کے "طبقاتی" تفریق کی گرہوں کو مستحکم رکھنا چاہتے تھے وہ فریقِ مخالف قرار پاتے تھے۔ یہی بنیادی طور پر کفر اور اسلام کا امتیاز تھا۔ قرآن کریم اس فریقِ مخالف کو مترفین یعنی سرمایہ داروں کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے جن کی تائید و حمایت مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سردارانِ قوم اور مذہبی پیشواؤں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فرعون، ہامان اور قارون ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ آسمانی رشد و ہدایت کی ساری تاریخ انہی دو گروہوں کے باہمی تصادم و تزاحم کی داستان ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تا آنکہ جب انسانیت کے سنِ بلوغ کو پہنچنے کا زمانہ آ گیا تو خدا کی طرف سے آخری نبی آیا۔ اور اپنے ساتھ وہ ضابطۂ ہدایت لایا جس میں اس مقصد کے حصول کا مکمل پروگرام دیا گیا تھا۔ اس رسول نے آکر اعلان کیا کہ — يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۷/۱۵۸) اے نوعِ انسان میں تم سب کی طرف خدا کا پیامبر ہوں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس خطاب میں کس طرح انسانوں کی خود ساختہ حدود و ثغور سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ کچھ اپنے متعلق کہا اور اپنے پیغام کے متعلق اعلان کیا کہ — يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ۔ (۱۰/۵۷) اے ساری دنیا میں بسنے والے انسانو! تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ ہدایت آ گیا ہے جو تمہارے نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہوسِ زرپرستی ایک نفسیاتی مرض ہے اسی لئے قرآن کو اس مرض کے لئے نسخۂ شفا کہا گیا ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر کہا۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ۔ (۱۰/۱۰۸) اے نوعِ انسان! تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تمہارے پاس الحق (THE TRUTH) آ گیا۔ اب تمہیں انسانوں کے خود ساختہ فریب انگیز نظاموں کی پیروی چھوڑ دینی چاہیئے۔ عالمگیر انسانیت کے نام اس رسول کا پیغام یہ تھا کہ:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ - الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ - (۲/۲۱-۲۲)

اے نسلِ انسانی! تمہیں چاہیئے کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومی اختیار کرو۔ اس خدا کے قوانین کی جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کو پیدا کیا اور کائنات کی اسقدر تخریبی قوتوں کے علی الرغم نسلِ انسانی کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اس مقام تک لے آیا۔ بس یہی طریق ہے جس سے تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رُو سے مل سکیگی جس کے مطابق اس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اور فضا میں کرّے بکھیر دیئے۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے۔ اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے۔ تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جانتے بوجھتے خدا کے ساتھ اور خدا ٹھرا کر دینے کے مرادف ہوگا۔

اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا ۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ - إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ - (۲/۱۶۸) اے نوعِ انسان! تم رزق کے سرچشموں کو تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھو اور اس میں سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق نہایت خوشگوار طریق سے کھاؤ پیو۔ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرکے انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ وہ تمہارا دوست نہیں دشمن ہے آپ نے عزیزانِ من! اس آیۂ جلیلہ کے الفاظ پر غور فرمایا۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ زمین سے حاصل ہو، اگر وہ تمام نوعِ انسان کے لئے سامانِ زیست بنتا ہے تو اسے رزقِ حلال وطیب کہا جائے گا۔ اور اگر اس کی یہ شکل نہیں رہے گی تو پھر یہ شیطانی رزق ہو جائے گا۔ اس پیغام کے دینے والے خدا نے، قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنا تعارف ربّ العالمین کہہ کر کرایا (۱/۱)۔ یعنی کسی خاص قوم، نسل، گروہ، خاندان، قبیلہ کا نشوونما دینے والا نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کو نشوونما دینے والا۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد سارا قرآن کریم خدا کی اسی ربوبیت عالمینی اور انسانیت ساز تعلیم کی تشریح ہے۔ اس نے خود قرآن کو ذکرٌ للعالمین

کہا ہے (۴۹/۱۳) اور اس کے لانے والے رسول کو رحمۃٌ للعالمین۔ (۲۱/۱۰۷)

وحدتِ انسانیت

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی تعلیم کس طرح انسانوں کی خودساختہ گروہ بندیوں کی زنجیروں کو توڑ کر، عالمگیر انسانیت کو اپنے آغوشِ عاطفت میں لاتی ہے، اور ان انسانوں کو، جنہیں مفاد پرستیوں کی ہوسِ خون آشامی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، پھر سے ایک عالمگیر برادری میں منسلک کرنے کی طرف عملی دعوت دیتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عدالتِ خداوندی میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جن کی روش یہ ہے کہ۔ يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ۔ (۲/۲۷)۔ جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا تھا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور یوں انسانوں کی اس بستی کو فساد انگیزیوں کی رزمگاہ بنا دیتے ہیں۔ یہ لوگ، یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے لئے زندگی کی آسائشیں سمیٹ لیتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ (۱۳/۲۵)۔ یہ لوگ اپنے آپ کو زندگی کی حقیقی سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم کرتے ہیں۔ انجام کار ان کا ٹھکانہ بہت بُرا ہوگا۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یاد رکھو! وہی نظریۂ حیات، وہی نظامِ زندگی، وہی عمل اپنے اندر باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو خاندان، قبیلہ، گروہ، نسل، قوم، وطن کی حدود سے آگے بڑھ کر تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوگا۔ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

قرآنِ کریم عزیزانِ من خالی وعظ نہیں کہتا۔ نہ ہی خدا کا رسول محض ایک "ڈاکیہ" ہوتا ہے کہ وہ خدا کا پیغام پہنچا کر چلا جاتا ہے۔ قرآن جس نصب العین کو پیش کرتا ہے اس کے حصول کا عملی پروگرام بھی دیتا ہے اور اس کا رسول، اس پروگرام پر عمل کر کے، یہ بتا اور دکھا دیتا ہے کہ یہ پروگرام نہ تو ناممکن العمل ہے اور نہ ہی اپنی کامیابی کے لئے کسی ما فوق الفطرت اجنبی کا محتاج۔ انسانوں کے لئے یہ پروگرام ہے اور انسانوں کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لاتے وقت، قدم قدم پر اعلان کرتا جاتا ہے کہ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک جماعت کی تشکیل کرتا ہے جس کی خصوصیات یہ بتاتا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اس جماعت کو نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا جا رہا ہے۔ یہ جماعت عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اس میں رنگ، نسل، قومیت، وطن کی تمیز و تفریق کے بغیر ہر وہ انسان شامل ہوتا ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بنا پر وحدتِ خلق کے مسلک کا پیرو ہونا چاہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وحدتِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، انفرادی مفاد پرستی کا سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس لئے اس نظام کو مٹا کر، اس کی جگہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کا نفاذ اس جماعت کا فریضہ قرار

پاتا ہے۔ سورۃ زخرف میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ۔ وَ لَوْ لَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ۔ وَ لِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّکِـُٔوْنَ۔ وَ زُخْرُفًا۔ وَ اِنْ کُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ (۴۳/۳۳-۳۵)

اگر مقصود فطرت یہ نہ ہوتا کہ تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بننا ہے تو ہم ان لوگوں کو جو ہمارے نظامِ ربوبیت عالمین سے انکار کر کے سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینا چاہتے ہیں، ایسا بے لگام چھوڑ دیتے کہ وہ اتنی دولت جمع کر لیتے جس سے ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں تک چاندی کی ہو جاتیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور کرسیاں سونے کی۔ لیکن طبقات میں اس تفاوت سے نوع انسان ایک برادری بن سکتی۔ اس لئے ہم ایسی جماعتیں پیدا کرتے رہتے ہیں جو دولت کی اس غلط تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں اور اس حقیقت کو عام کرتی ہیں کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود صرف اسی زندگی کی آسائش و آرائش نہیں، اس کی مستقبل کی زندگی کی فلاح و بہبود بھی ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ معاشرہ قوانین خداوندی کے تابع رہے۔ نظامِ سرمایہ داری کے تحت یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ نوع انسان کی عالمگیر وحدت کے لئے نظام ربوبیت کا قیام لاینفک ہے لیکن یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا جب تک ذرائع رزق اس نظام کے کنٹرول میں نہ ہوں۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے اس جماعت کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قوانین سازی کا اختیار کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس میں اس کا امکان نہیں ہوتا کہ کوئی گروہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے اپنی مرضی سے قانون بنا لے گا۔ یہ قوانین، غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے معیارِ مطلق (ABSOLUTE STANDARD) ہوتے ہیں۔ ان کے اصول وحدود خدا کے مقرر کردہ اور غیر متبدل ہوتے ہیں جن کا اطلاق تمام انسانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ مفکرینِ عالم، وحدتِ انسانیت کے لئے وحدتِ حکومت کا قیام بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے واحد حکومت کس طرح عمل میں آسکتی ہے۔ اس کا طریق قرآن بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وحدتِ حکومت کے لئے وحدتِ قانون ناگزیر شرط ہے۔ یعنی ایسے ضابطہ قوانین کا وجود جس کا اطلاق تمام نوع انسان پر یکساں ہو۔ اس قسم کا ضابطہ انسانوں کا وضع کردہ ہو نہیں سکتا۔ انسان جو قانون بھی مرتب کریگا، اس میں اس کے رجحاناتِ قلبی اور میلاناتِ ذہنی کی آمیزش ضرور ہو گی۔ اس قسم کی رنگ آمیزی سے

بالا صرف خدا کا وضع کردہ ضابطہ قوانین ہو سکتا ہے جو انسانی جذبات و عواطف سے بالا ہے، اور تمام نوعِ انسان کی نشوونما جس کے پیشِ نظر ہے۔ یہ نظام، وحدتِ قانون کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے اور مختلف اقوام و ممالک کی خود ساختہ لکیروں کو مٹاتا ہوا ایک عالمگیر اُمت کی تشکیل کئے جاتا ہے۔ وہ اصول و اقدار جن کی بنیادوں پر یہ نظام استوار ہوتا ہے، ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں، لیکن ہر زمانے کے انسانوں کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنی ضروریات کے مطابق جزئی قوانین خود وضع کریں۔ اس سے نہ تو انسان ایسا سرکش اور بے لگام ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے من مانے قوانین بنا بنا کر دوسروں کو اپنا محکوم بناتا چلا جائے اور نہ ہی ایسا پابہ زنجیر ہو جاتا ہے کہ زمانہ کہیں سے کہیں چلا جائے اور وہ قدامت پرستی اور تقلید کے بندھنوں میں جکڑا رہے۔ یہ اصول و قوانین عقل و فکر کے تقاضوں کی تسکین کرتے ہیں اور انہیں علم و بصیرت کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا اس امت کا اولین فریضہ ہوتا ہے لیکن وہ تسخیرِ فطرت، تخریبِ آدم کے لئے نہیں کرتی، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے کرتی ہے۔ احترامِ آدمیت اس کا مطمحِ نگاہ ہوتا ہے اور "آدم" میں چونکہ مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں، اس لئے اس نظام میں جنس (SEX) کی بنا پر انسان اور انسان میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اس میں مرد اور عورت دوش بدوش آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی انسان نہ دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

یہ نظام نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے متعلق مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً....

کعبہ اور حج کی حیثیت

اجتماعات منعقد کرے گا۔ ان میں مرکزی حیثیت اس اجتماع کو ہوگی جسے حج سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کعبہ جس کا مرکز ہے۔ کعبہ اور حج کے متعلق قرآن کا پیش کردہ تصور بڑا غور طلب ہے۔ کعبہ اینٹ اور پتھر کی اس عمارت کا نام نہیں جو مکہ میں ایستادہ ہے۔ جس طرح آج ہم (مثلاً) جب "ماسکو" کہتے ہیں تو اس سے ایک خاص شہر مراد نہیں ہوتا بلکہ یہ لفظ نمائندگی کرتا ہے اس نظام کی جو روس میں نافذ ہے۔ اسی طرح کعبہ درحقیقت ترجمانی کرتا ہے اس نظام کی جو نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ دیکھئے، قرآن کریم اس نکتہ کی وضاحت کیسے دلنشیں الفاظ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

دنیا میں ایسے مراکز تو موجود تھے جو کسی خاص قوم، خاص قبیلہ یا خاص مذہب سے نسبت رکھتے تھے لیکن ایسا کوئی مرکز نہیں تھا جسے خالص انسانیت کا مرکز کہا جا سکے۔ اس قسم کا مرکز کعبہ کو بنایا گیا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا۔ (۳/۹۵) یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں پہلا گھر جسے انسان کا گھر کہا جا سکے، مکہ میں بنایا گیا جو بڑا ہی بابرکت ہے۔ اس گھر کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ (۳/۹۷) جو بھی اس میں داخل ہو گیا — یعنی اُس نظام کے سایۂ حفاظت میں آ گیا جس کا مرکز وہ گھر ہے، وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ لہٰذا کعبہ نوعِ انسانی کی پناہ گاہ ہے۔ وہ دنیا بھر کے ستائے ہوئے انسان کے لئے امن کا نشیمن ہے۔ دوسری جگہ ہے — وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا۔ (۲/۱۲۵) اس گھر کو اس لئے بنایا گیا ہے کہ تمام انسان اپنے اختلافات ختم کر کے ایک مرکز پر جمع ہو سکیں۔ اور اس طرح آلامِ روزگار سے امن و سلامتی حاصل کر لیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷) کعبہ کو واجب الاحترام مرکز اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس نظام کی رُو سے جس کا یہ مرکز ہے، عالمگیر انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔ اسی لئے اسے "شہر آزاد" (OPEN CITY) قرار دیا گیا ہے۔ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَ الْبَادِ۔ (۲۲/۲۵) اسے وہاں کے بسنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں کھلا رکھا گیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ نبی اکرمؐ کا یہ حکم ہے کہ مکہ کے مکانات کرایہ پر نہیں دیئے جا سکتے۔ اس مرکزی مقام میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں شرکت کی دعوت تمام نوعِ انسان کے لئے عام ہے۔ چنانچہ معمارِ حرم حضرت ابراہیمؑ جب تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو ان سے کہا گیا کہ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (۲۲/۲۷)۔ تمام نوعِ انسان کو حج کے لئے پکار کر دعوت دے دے۔ اور انسانوں سے کہا گیا کہ — وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (۳/۹۶) — جو بھی وہاں تک پہنچنے کی راہ پائیں وہ اس اجتماع میں شریک ہوں۔ لیکن وہ اس اجتماع میں شرکت اس لئے نہ کریں کہ وہاں جا کر کمزور قوموں پر ظلم و زیادتی کی اسکیمیں سوچی جائیں گی، یا لوگوں سے قوانینِ خداوندی کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کرائی جائے گی۔ جن لوگوں کی یہ ذہنیت اور نیت ہو گی وہ ان اجتماعات میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ (۲۲/۲۵) شریک ہونا تو ایک طرف، انہیں تو اس کے پاس پھٹکنے تک نہیں دیا جائے گا (۹/۲۸)۔ عالمگیر انسانیت کو ان اجتماعات میں شرکت کی دعوت اس لئے دی جائے گی کہ لِیَشْہَدُوْا مَنَافِعَ لَہُمْ۔ (۲۲/۲۸) تاکہ وہ وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ

یہ نظام' اُن کے فائدے کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ نظام جسے قرآن' وحدتِ انسانیت کے لئے تجویز کرتا ہے۔ اس نظام کو وہ حق کا نظام کہتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ نظام جو انسانیت میں تفریق کا موجب بنتا ہے' اس کے نزدیک باطل کا نظام ہے

حق وباطل کی کشمکش

قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ٹکراؤ کمیونزم کے فلسفۂ تاریخ کا ٹکراؤ نہیں جس میں کبھی ایک نظام غالب آجاتا ہے اور کبھی اس کے برعکس دوسرا نظام۔ حق وباطل کے ٹکراؤ میں' حق آہستہ آہستہ باطل پر غالب آتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے جو حق کی علمبردار بن کر رزمگاہِ حیات میں باطل کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے' تو حق کا غلبہ دنوں کے اندر ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ حق کائناتی قوتوں کی رُو سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسے ہماری اصطلاح میں زمانے کے تقاضے کہتے ہیں۔ لیکن اس طرح حق کے غالب آنے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں' خدا کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب انسان' وحی کی راہ نمائی میں جادہ پیما ہوتا ہے تو اس کا سفرِ حیات دنوں میں طے ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کا اتباع نہیں کرتا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایک راستہ اختیار کرتا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ راستہ غلط ہے۔ پھر وہ دوسری راہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ عقل کے تجرباتی طریق (TRIAL AND ERROR) سے' مختلف راستوں کی ٹھوکریں کھاتا' ایک عرصہ دراز کے بعد صحیح منزل پر پہنچتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے' اپنے رفقاء کی جماعت کے ساتھ' وحی کی روشنی میں اس راستہ کو اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظام' چند دنوں میں قائم ہو گیا۔ اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح دیکھتے دیکھتے' مختلف ملکوں' نسلوں' قوموں کے افراد ایک ایسی برادری کے رشتے میں منسلک ہو گئے جس میں تفریق و تقسیم کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مفاد پرست قوتوں نے پھر سر ابھارا اور اس نظام کی جگہ پھر اسی نظامِ کہن نے لے لی جس میں انسان اور انسان میں بُعد و مغایرت پیدا ہو گئی ——— خود مسلمانوں کے اندر مذہبی فرقوں کی تفریق' جسے قرآن نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا تھا' نسلوں کی تفریق' ذات پات کی تفریق' امیر اور غریب کی تفریق' ادنیٰ اور اعلیٰ کی تفریق' حاکم

اور محکوم کی تفریق، آجر اور مستاجر کی تفریق۔ بندہ اور آقا کی تفریق۔ اور یہی نظام مسلمانوں میں آج تک چلا آرہا ہے۔ یاد رکھیئے۔ یہ نظام غیر قرآنی۔ ہے۔ اسے اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔

لیکن اگر یہ نظام مسلمانوں کے ہاں باقی نہیں رہا تو اس سے عالم انسانیت کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نظام کے اصول اور اسے متشکل کرنے کا پروگرام قرآن کے اندر موجود اور محفوظ ہے اور جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقوق کسی خاص قوم کے حق میں محفوظ نہیں، اسی طرح قرآن پر بھی کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں۔ یہ ذکرٌ للعالمین ہے، بصائر للناس ہے۔ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے کھلا ہوا صحیفہ ہے۔ جس کا جی چاہے اسے اپنا لے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے مقابلہ میں مغربی ممالک کی غیر مسلم اقوام میں اسے اپنانے کے رجحانات زیادہ ہیں۔ مسلمان اپنے مروجہ نظام کو حق کا نظام سمجھ کر ایک گہرے فریب میں مبتلا ہے۔

جس کا جی چاہے اسے اپنا لے

—— جس قوم پر بھی مذہبی پیشوائیت کا غلبہ ہوگا اس کی یہی حالت ہوگی —— لیکن اقوامِ مغرب ... اپنے ہاں کے مروجہ نظامہائے حیات سے بُری طرح تنگ آچکی ہیں۔ اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) وہ ایک ایسے نظام کی تلاش میں مضطرب و بیتاب نظر آتی ہیں جو وحدتِ انسانیت کا ضامن بن سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام، قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ اسلئے خود زمانے کے تقاضے انسان کو اس طرف لا رہے ہیں۔ اس کی نشاندہی بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہوئی ہے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا، وحدتِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ دیکھئے۔ قرآن کریم اس آنے والے دور کی نشاندہی کرتا ہوا، اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ۔ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ (۸۳/۱-۳) ۔ یاد رکھو! تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لئے جائیں لیکن جب ان کے واجبات دینے کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی ماردی جائے۔ دوسروں سے کام پورا پورا لیا جائے لیکن اس کام کا معاوضہ کبھی پورا نہ دیا جائے۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے۔ چیزوں ہی کو نہیں بلکہ خود انسانوں کو تولتے اور ماپتے وقت بھی یہی خیال غالب رہے اور کوشش کی جائے کہ

ان کی صلاحیتیں دبی، سمٹی، سکڑی اور بندھی رہ جائیں۔ انہیں اتنا ہی ابھرنے دیا جائے جتنی وہ سرمایہ داروں کے منافع کے لئے مفید ہوں۔ انہیں اس سے زیادہ آزادی دی ہی نہ جائے۔ اس کے بعد کہا۔ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۔ (۸۳/۴) کیا ان لوگوں کو اس کا خیال نہیں آتا کہ یہ نظام ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ وہ وقت آئے گا جب انہیں انسانیت کے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۔ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (۸۳/۵،۶) یہ اس انقلاب عظیم کے وقت ہوگا جب انسانیت خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس دور کی بہت سی نشانیاں قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱/۴) جب اونٹ جیسا مفید جانور تیز رفتار ذرائع سفر کی ایجاد سے بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱/۵) جب پسماندہ اور وحشی اقوام میں بھی اجتماعی زندگی کا احساس بیدار ہو جائے گا۔ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۔ (۸۱/۶) جب سمندر جہازوں اور کشتیوں سے معمور ہو جائینگے۔ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ جب آبادیاں یہاں سے وہاں تک ملتی ہوئی چلی جائیں گی۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۔ (۸۱/۱۰) جب کتابیں، مجلات، اخبارات بہت زیادہ پھیل جائیں گی۔ وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ۔ (۸۱/۱۱) جب آسمانی کروں پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے جائینگے۔ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ: وَاَلْقَتْ مَا فِیْھَا وَتَخَلَّتْ ۔ (۸۴/۳،۴)۔ جب ذرائع رسل و رسائل کے عام ہو جانے سے زمین پھیل جائے گی اور اپنے معدنی ذخائر کو باہر نکال پھینکے گی اور اس طرح اندر سے خالی ہو جائے گی۔ یہ تو خارجی کائنات میں رونما ہونے والے انقلابات کی نشاندہی ہے۔ خود انسانی دنیا کے اندر بھی ایک عظیم انقلاب آئے گا۔ اور وہ یہ کہ۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۸۱/۸،۹)۔ جب عورت کہ جسے مردوں کے استبداد نے زندہ درگور کر رکھا ہے، انسانیت کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور وہاں یہ سوال پوچھا جائے گا کہ اسے بالآخر کس جرم کی پاداش میں مدفون رکھا گیا تھا۔ یعنی اس دور میں صرف زمین کے مدفون خزانے ہی ابھر کر باہر نہیں آئینگے، انسانوں کے ہاتھوں کی دفن کردہ مظلوم عورت بھی دوبارہ زندہ ہو کر مسند انسانیت پر آجائے گی۔ یہ ہے وہ دور جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسانیت، خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اور نظام سرمایہ داری الٹ جائے گا۔

لیکن یہ کچھ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی رُو سے نہیں ہوگا جس میں انسان کے لئے وہ جذبۂ محرکہ نہیں ہوتا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور کم از کم اپنے لئے رکھ کر، باقی دوسروں

کمیونزم کے ذریعے نہیں

کی ضروریات پوری کرنے کے لئے برضا و رغبت دے دے۔ نہ ہی ان کے ہاں مستقل اقدار و مطلق معیار حق و باطل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظام میں یہ کچھ (REGIMENTATION) کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے جس سے فرد کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم جو نظام لاتا ہے اس میں اتنا ہی نہیں ہوتا کہ ہر فرد کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہتی ہیں بلکہ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ (۸۲/۱۹) کسی فرد کا دوسرے فرد پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار نہیں ہوتا۔ اس میں ہر فرد کو مقام آدمیت نصیب ہوتا ہے اور وہ شرف انسانیت سے بہرہ یاب و سرفراز ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نظام میں آئین و قوانین بھی باقی نہیں رہتے اور معاشرہ (کمیونزم کے فلسفہ کے مطابق) لاملکتی اور لاقانونی ہو جاتا ہے۔ نہیں۔ اس میں لاقانونیت نہیں پھیلتی۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (۸۲/۱۹) اس میں تمام معاملات، خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) انسانوں کا نہیں، خدا کے غیر متبدل قوانین کا ہوتا ہے۔ اس میں مستقل اقدار اور مطلق معیار حق و باطل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یوں اس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔

کس درایں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہ ہوگا وہ دور جس کے متعلق کہا کہ۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (۱۴/۴۸)۔ اُس وقت یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

آخری سہارا

یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت، جو انسانیت کا آخری سہارا ہے اور جس سے جنت سے نکلا ہوا آدم، پھر سے جنت کو پالے گا۔ قرآن کی رُو سے انسان کا انجام تباہی نہیں، سرفرازی و سربلندی ہے۔ اس کے سفرِ حیات کا مآل، پستیوں کے عمیق غار نہیں، بلکہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ (۸۴/۱۹) اس شہسوار کو بلند سے بلند تر مقامات کی طرف چڑھتے چلے جانا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں قرآن کا پیغام ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو طوفانوں میں گھری ہوئی کشتیٔ انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اقبالؒ کی آنکھ نے قرآنی بصیرت کی مدد سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا کہ "جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریب قریب ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔" اقبالؒ نے اس نئی دنیا کا ایک دھندلا سا خاکہ دیکھا تھا لیکن اب زمانے کے تقاضوں سے وہ دھند آہستہ آہستہ چھٹ رہی ہے۔ اور وہ دنیا جسے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں تعمیر کر رہی تھی، اُفقِ کائنات سے اُبھر کر سامنے آ رہی ہے۔ انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا پیغامِ مرگ نہیں، امیدوں کی نشید حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائر پیش رس ہوتی ہے۔ یہ وہ آخری شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشید جہانتاب کی پہلی کرنوں کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہو گئی اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت (لیڈرشپ) ہوگی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں امید جس کی وجہ سے میں ابھی یہ کہتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ ؎

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو ! !
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

والسلام!

عورت کی مظلومی

دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال

طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۶۸ء میں ہم نے (باب المراسلات میں) ایک محترمہ بہن کی درد بھری کہانی درج کر کے معاشرہ کے دردمند، اسلام دوست، عدل پسند احباب سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ستم رسیدہ طبقہ کو اس کے جائز قرآنی حقوق دلانے کے لئے کچھ کریں۔ اس اپیل کے جواب میں ہمیں کچھ خطوط ملے یا ملا زدہ طبقہ کی طرف سے موصول ہوئے جن کا انداز (حسب توقع) یہ تھا کہ ماتھے پر سینکڑوں شکن، آنکھیں انگارے کی طرح سرخ، منہ میں جھاگ، جسم پر کپکپی، ہاتھ میں لٹھ لیے گالیاں دینے چلے آ رہے ہیں ـــ چڑھا دو عورتوں کو سر پہ ـــ بٹھا دو انہیں مردوں کے برابر ـــ کر دو گھروں کا سکون تباہ و برباد ـــ بنا دو انہیں میم صاحب ـــ اور ان "متشابہات" کے بعد وہ "محکمات" جن کی تعلیم ہمارے مکتبوں اور دارالعلوموں میں عام طور پر دی جاتی ہے۔ چونکہ گالیوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا اس لئے ہم وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا کے ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں خاموش آگے بڑھ جاتے ہیں۔

بے شمار خطوط اس مظلوم طبقہ کی طرف سے موصول ہوئے جن میں سے اکثر بڑی ہی درد انگیز اور المناک داستانوں کے مرقع تھے۔ بہت سی بیٹیوں اور بہنوں کی طرف سے دعائیں اور نیک آرزوئیں موصول ہوئیں۔ ان کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

بعض حضرات نے ہمیں اپنے مشوروں سے بھی نوازا۔ اکثر نے تعاون کا وعدہ کیا۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔

ان میں ایک گرامی نامہ ایسا ہے جسے ہم بصد تشکر و بہ ہزار مسرت درج ذیل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں بعض قانونی پہلوؤں کو اس طرح روشن کیا گیا ہے کہ اس سے بہت سی الجھنوں کا حل از خود مل جاتا ہے۔

اس گرامی نامہ کے آخر میں محترم ظفر احسن محمود صاحب نے جو پیش کش کی ہے اس کے لئے ہم بصمیم قلب ممنون ہیں ۔۔۔ ان کے اس جذبہ صادقہ سے ہمارے دل میں یہ احساس بیدار ہو گیا کہ

ہے جو تاشیر سی فغاں میں ابھی
لوگ باقی ہیں کچھ جہاں میں ابھی

ہمیں امید ہے کہ ہماری مظلوم بہنیں اپنے اس غمگسار بھائی کی اس مبنی بر خلوص پیشکش سے فائدہ اٹھائینگی۔

(طلوع اسلام)

گرامی نامہ محترم ظفر احسن محمود صاحب

محترمی!

ماہ ستمبر کے شمارہ میں جس جرأت اور بیباکی سے عورتوں کی مشکلات اور اُن کی بے چارگی کے متعلق قلم اٹھایا ہے اور جس محبت اور ہمدردی سے اُن کے دُکھ کی ترجمانی کی ہے اُس کی مثال کم ملتی ہے۔ میں آپ کو لائق صد تبریک سمجھتا ہوں۔

اگرچہ ہمارا نظام عدل بہت اصلاح طلب ہے مگر ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ سرمایہ دار نظام معاشرہ کا ایک جزو ہے۔ اور اس لئے ہمارے یہاں دیگر اجناس اور ضروریاتِ زندگی کی مانند عدل و انصاف حاصل کرنے پر بھی کچھ نہ کچھ خرچہ ضرور اُٹھتا ہے۔ سوال اس میں مرد اور عورت کا نہیں، سوال امیر اور غریب کا ہے۔ عورت چونکہ بالعموم محتاج اور غریب ہوتی ہے اس لئے دروازۂ عدل میں سے گزرنا اُس کے لئے دشوار اور گراں ہوتا ہے۔ اصل بنیادی مسئلہ کی نشان دہی تو آپ نے خود ہی فرمادی ہے۔ اصل مسئلہ معاشی اور معاشرتی تحفظ کا ہے۔ یعنی "کھائے کہاں سے اور جائے کہاں"۔ ہمارے معاشرہ میں تو عورت کی حیثیت ایک مزدور سے زیادہ نہیں جس کے فرائض میں محنت کے علاوہ جنسی خدمت بھی شامل ہے اور اُس کی اُجرت اور معاوضہ اُسے روٹی کپڑا مکان میں ر تشش ملتا ہے۔ بڑا ہوا تو اُسے "زمرد کا گلوبند" لے دیا۔

تاہم میں یہ عرض کروں گا کہ منجملہ دیگر متعدد وجوہات کے ہماری خواتین کی مشکلات اور پریشانی کا باعث ایک اُن کی قانون سے عدم واقفیت بھی ہے۔ عدل و انصاف تو اب اس قدر گراں اور سخت یاب نہیں رہا جس قدر قانونی مشورہ اور قانونی امداد ہے۔ یہ ناسپاس گزاری ہوگی اگر ہم اپنی موجودہ حکومت کی اُن انقلاب آفریں مساعی کا اعتراف نہ کریں جو انہوں نے ہماری عائلی مشکلات اور خواتین کی مظلومیت کو دور کرنے کے لئے کی ہیں۔ طریقِ کار آسان کر دیا گیا ہے، بھاری کورٹ فیس سے نجات دے دی گئی ہے اور دیگر

ہر طرح سے آسانیاں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ البتہ چونکہ عائلی عدالتوں کا اختیار بھی عام دیوانی عدالتوں کو ہی دیا گیا ہے اس لئے وہاں انصاف دیریاب ضرور ہے۔ اگر اولین منصوبہ کے مطابق یہ عدالتیں بالکل الگ تھلگ بنا دی جاتیں تو بہت بڑی اصلاح اور تبدیلی منظرِ عام پر آجاتی۔ حکومت کی ان مخلصانہ کوششوں کے علاوہ اس بارہ میں جس پامردی، جرأتِ ایمانی اور خلوصِ نیت سے عورت کے حقوق دلوانے میں ہماری عالیہ عدالتوں نے حصّہ لیا ہے اُس کے لئے قرآن کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہوگی۔ صدیوں کی تقلید اور اسلاف پرستی میں ملفوف فقہِ اسلامی کو جس طرح جھاڑ جھنکار سے صاف کر کے ایک پاک، مصفّٰی اور صحیح قرآنی نقشہ ترتیب دی جارہی ہے اُس کے لئے ملّتِ اسلامیہ ہمیشہ ہمیشہ ان گمنام فاضل ججوں کی مرہونِ منّت اور ممنونِ احسان رہے گی۔ قرآن اور سنّت سے متحارب و متضاد مصادم اصول و قوانین کو جھٹک جھٹک کر یہ لوگ علیحدہ کر رہے ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جو صدیوں میں علماء اور فقہا اور مُلّا مل کر بھی نہ کر سکے۔ طرّہ یہ ہے کہ نہ کسی سے تحسین کی تمنا ہے، نہ جزار کی آرزو۔

نہ سرو برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں!

جن اذیت انگیز حالات کے متعلق آپ نے تذکرہ فرمایا ہے۔ اُن کے متعلق عرض کروں گا کہ محترم بہن کی بیشتر زیادہ تر غلط فہمی اور قانون سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ سابقہ دعویٰ تنسیخ نکاح کے اخراج کے باوجود وہ حقِ خلع کے تحت پھر سے عدالت کی طرف رجوع کر کے اپنا نکاح فسخ کر سکتی ہیں۔ اور ناپسندیدہ خاوند سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری عالیہ عدالتوں اور بالخصوص سپریم کورٹ نے سابقہ فقہ کے غیر قرآنی تصورات کو جھٹک دیا ہے اور واشگاف الفاظ میں قرار دیا ہے کہ قرآن کریم کی واضح ہدایات کے بعد ہم کسی بھی فرد کی رائے یا تفسیر، یا توجیہات کے پابند نہیں خواہ وہ کتنا ہی محترم کیوں نہ ہو اور اُس کے ساتھ کیسی ہی عقیدت کیوں نہ وابستہ ہو۔ پاکستانی عدلیہ کے لئے اولین سند خدا کی کتاب ہے۔

اُنہوں نے طے یہ کیا ہے کہ اگر زوجین میں ناچاقی اور شقاق اس حد کو پہنچ جائے کہ اعادۂ تعلقات ناممکن ہو جائے اور فریقین کی یکجائی ایک عیب اور نفرت انگیز اذیت بن جائے تو مرد طلاق دے کر علیحدہ ہو سکتا ہے اور اس کے بالمقابل کتاب الٰہی نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ عورت قانون کی امداد کا سہارا لے گی اور عدالت کو مطمئن کرنے کے بعد کہ اب اعادۂ حقوقِ زوجین ناممکن ہے اور فریقین کی مصاحبت فی نفسہٖ خدا کی وضع کردہ حدود کا تجاوز اور اُن کی خلاف ورزی ہوگی، عدالت مجبور ہو جائے گی کہ نکاح کو فسخ کر کے فریقین میں مناکحت ختم کر دے۔ اس میں البتہ عورت کو وہ تمتعات واپس کرنا ہوں گے جو خاوند نے بطور تحائفِ عروسی اُسے دیئے ہیں یا اُن کا مناسب معاوضہ عدالت اُسے دلوائے گی۔

ڈگری اعادہ حقوقِ زن و شوہر کسی صورت میں حق خلع کی بنیاد پر کئے جانے والے مطالبۂ تنسیخ نکاح میں حارج نہ ہے، نہ ہی پہلے مقدمات کا مسترد ہو جانا کسی صورت میں مانع دعویٰ ہے۔

مبینہ ناقابلِ برداشت حالات میں ایک ناپسندیدہ مرد کے سامنے خود سپردگی بے شک شرفِ انسانیت کی وہ توہین ہے جسے کم از کم اسلامی معاشرہ تو برداشت نہیں کر سکتا لیکن عزیزہ بہن کی یہ لاچاری بھی قانونی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ہاں کی کوئی عدالت خواہ وہ کتنی ہی عالی کیوں نہ ہو اور کوئی بھی ڈگری وہ کیسی ہی وقیع کیوں نہ ہو عورت کو کبھی بھی جسمانی اختلاط کے لئے مجبور نہیں کرتی۔ اعادہ حقوقِ زن و شوہر کی ڈگری کے کچھ دیگر اثرات تو ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ عورت خرچہ نان نفقہ کی حقدار نہیں رہتی۔ اُس کے ذاتی سامان وغیرہ کی قرقی ہو سکتی ہے مگر اُس کا بھی مناسب تدارک درست قانونی چارہ جوئی سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ تو ہم بلا خوفِ تردید حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس ڈگری کا وہ اذیت انگیز اور کرب ناک مقصد کبھی بھی قانون کے پیشِ نظر نہیں جس پر محترمہ نے غلط فہمی کی بنا پر خود کو مجبور سمجھ رکھا ہے۔

منجملہ دیگر مجبوریوں کے آپ نے مسئلہ حضانت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں درست پوزیشن یہ ہے کہ لڑکے کی سات سال کی عمر تک اور لڑکی کے سنِ بلوغ تک کی تحویل کا قطعی حق اُن کی والدہ کو ہے۔ یہ حق صرف چند مخصوص حالات میں زائل ہوتا ہے جو نارمل حالات میں رونما پذیر نہیں ہوتے۔ مثلاً والدہ کا واضح اور عیاں طور پر بدکار ہونا وغیرہ۔ ہماری سابقہ فقہ میں اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ اس عمر کی حد کے بعد نابالغ کو باپ کے حوالے کر دیا جائے۔ پاکستان کی خدا دوست عدالتوں نے یہ نظریہ بھی مسترد کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں عمر کی قید کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ عدالت کے سامنے ایک ہی بنیادی امر ہوتا ہے کہ بچہ کی بہبود اور بہتری کہاں رہنے میں ہے اور فیصلہ عموماً والدہ کے حق میں ہی دیا جاتا ہے۔ جب تک بچہ عاقل اور بالغ نہیں ہو جاتا اور اپنے نفع و نقصان کو اچھی طرح سمجھنے نہیں لگ جاتا اُسے والدہ کی حضانت سے نہیں نکالا جاتا تاآنکہ یہ امر بدیہی طور پر ثابت نہ ہو جائے کہ نابالغ کا مفاد اب والدہ سے علیحدہ رہنے پر ہی منحصر ہے۔ اس حضانت کے دوران میں عائلی قوانین کے تحت ایک آسان اور سہل طریقِ کار کے مطابق والدہ اپنے بچوں کی کفالت کے لئے مناسب اور معقول خرچہ خاوند سے حاصل کر سکتی ہے جس کی ادائیگی کے لئے وہ مجبور و مکلف ہے۔

اگر خاوند نابالغ بچہ کو والدہ کی تحویل سے زبردستی نکال لے جائے تو وہ اغوا کے جرم کا اُسی طرح مستوجب ہے جس طرح کوئی دوسرا آدمی۔ اور عورت اُسے سزا دلوا سکتی ہے۔ اسی طرح قانون اس امر کا بھی تحفظ دیتا ہے کہ اُس کی تحویل سے کسی دھونس دھاندلی سے اُس کے نابالغ بچہ کو خاوند چھین نہ سکے۔ یہ تمام تر اندیشے دراصل اس احساس پر مبنی ہیں کہ مقدمات کی صبر آزما طوالت، کمر توڑ اور ہمت شکن اخراجات اور وہ ذلیل اور ہتک آمیز

سلوک جو ہماری عدالتوں میں فریقینِ مقدمہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ خاوند کے ظلم وستم سہہ لئے جائیں۔ اخراجات اور طریقِ کار کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں۔ عائلی عدالتوں کے متعلق اگر کوئی ایسا انتظام ہوجائے کہ اُن پر قانون دان، پڑھی لکھی۔ قانون دان اور دنیا کے سرد و گرم کو جاننے والی معزز خواتین فائز کی جائیں تو میرے خیال میں یہ معاملہ بہت حد تک حل ہو سکے گا۔

محترمی! جس جہاد کا بیڑہ آپ نے اٹھایا ہے، خدا آپ کو اس میں کامیابی عطا کرے۔ اس راہ میں اگرچہ فی الحال آپ کی آواز تنہا ہے مگر ظاہر ہے کہ آپ کو بہت سے رفیق مل جائینگے۔ مظلوم و مجبور بیٹیوں کا جو درد آپ نے کر اُٹھے ہیں، خدا کے ہاں یقیناً بے حد مستحسن ہے اور احکامِ قرآنی کے نزدیک عین فرض۔

میں اس سلسلہ میں ایک حقیر سی پیشکش کرنا چاہتا ہوں جو آپ کے عظیم مقصد میں کسی طور پر بھی کوئی معتدبہ معاونت کہلانے کی مستحق تو نہیں ہوسکتی مگر میں احکامِ قرآن کے تحت اپنے اُن مظلوم بہنوں اور بیٹیوں کا حق معلوم سمجھتا ہوں کہ اُن مشکلات اور الجھنوں کے لئے اپنی بساط کے مطابق صحیح قانونی رہنمائی اور قانونی امداد حاضر کروں۔ میری خدمات آپ کے موقر جریدہ کے لئے وقف ہیں۔ اُن تمام سوالات کا خاطر خواہ جواب دینے کے لئے میں تیار ہوں جو مجھے آپ کی معرفت موصول ہوں گے۔ براہ راست بھی مجھے ایسی امداد میں کسی قسم کا تامل نہ ہوگا۔ اُمید ہے میری یہ پیشکش صحیح قانون فہمی میں ممد و معاون ہوگی اور بہت سی الجھنوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکے گی۔ وما توفیقی الا باللہ!

آپکا نیازمند
ظفر احسن محمود۔ ایڈوکیٹ۔
۴۔ بیگم روڈ۔ لاہور

ہندو کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کنونشن میں پرویز صاحب کا وہ خطاب جس نے حقیقت پر پڑے ہوئے بے شمار پردوں کو اٹھا دیا اور اس طرح ہندو اپنی اصل تصویر میں بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔ اس خطاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کا پمفلٹ چھپوا لیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسکی عام اشاعت کی جائے۔ ایک پمفلٹ کی قیمت ۵۰ پیسے ہے لیکن دس پمفلٹ اڑھائی روپے میں دیئے جائینگے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

ابوشہاب رفیع اللہ

طلاق اور خُلع

قرآن مجید کی رُو سے ایک عاقل، بالغ، مرد و عورت کا باہمی رضامندی سے ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ نکاح کہلاتا ہے۔ قرآن نے اسے مِیثَاقًا غَلِیظًا کہہ کر پکارا ہے (۴/۲۱)۔ اس باہمی رضامندی کے سلسلہ میں مردوں کے متعلق کہا کہ فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ (۴/۳) جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان میں سے نکاح کرو۔ اور عورتوں کے ضمن میں کہا کہ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا (۴/۱۹) تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ اس سے ظاہر ہے کہ نکاح اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مرد کے لئے "ماطاب" کی شرط پوری ہوتی ہو اور عورت کے دل میں کراہت نہ ہو۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جب مرد کی طرف سے پسندیدگی نہ رہے، یا عورت کے دل میں کراہت پیدا ہو جائے تو نکاح باقی نہیں رہتا۔ اسی کو طلاق کہا جاتا ہے — یعنی نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا۔

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے، ہمارے مروجہ قوانین کی رُو سے، ان کے سلسلہ میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ وہ جب بھی محسوس کریں کہ (ماطاب) کی کیفیت باقی نہیں رہی، معاہدہ نکاح فسخ کر سکتے ہیں۔ لیکن مقامِ صد تعجب ہے کہ قرآن مجید کی اس قدر کھلی ہوئی تعلیم کے باوجود عورت کا یہ اختیار اور حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے راستے میں سو روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں میں یہ بتانے کی کوشش کرونگا کہ اس سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق اور اختیارات میں کسی قسم کی تمیز روا رکھنا خلافِ قرآن اور خلافِ سنتِ رسول اللہ ہے۔

قرآن کی وہ آیت آپ نے دیکھ لی جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کے لئے معاہدہ نکاح سے آزاد ہو جانے کے لئے شرط اتنی ہی ہے کہ اس کے دل میں خاوند کی طرف سے کراہت پیدا ہو جائے۔ حدیث میں عورت کے حقِ طلاق کے سلسلہ میں، دو مشہور واقعات کا ذکر ہے اور یہ دونوں جناب ثابتؓ سے متعلق ہیں۔

(۱) عن ابن عباس ان جمیلۃ بنت سلول اتت النبی صلے اللہ علیہ وسلم

فقالت ما اعتب علی ثابت فی دین ولا خلق ولکن اکرہ الکفر فی الاسلام۔ لا اطیقہ بغضا۔ فقال لہا النبی صلے اللہ علیہ وسلم اتردین حدیقتہ۔ قالت نعم۔ قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اقبل الحدیقۃ وطلقہا تطلیقۃ[1]

"جمیلہ بنت سلول نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے اپنے شوہر ثابت سے دین یا کردار کی کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میں اسلام میں آجانے کے بعد پسند نہیں کرتی کہ کفر کی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ میں اپنی نفرت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کا باغ واپس کرنے پر تیار ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ باغ قبول کر لو اور اسے نکاح کے معاہدہ سے آزاد کر دو۔"

(۲) عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال کانت حبیبۃ بنت سہل تحت ثابت بن قیس بن شماس وکان رجلاً دمیمًا فقالت یا رسول اللہ لو لا مخافۃ اللہ اذا دخل علیّ لبصقت فی وجہہ فقال رسول اللہ صلعم اتردین علیہ حدیقتہ فقالت نعم۔ قال فردّت علیہ حدیقتہ ففرق بینہما رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم[2]

حبیبہ بنت سہل ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی تھی وہ بڑے پست قد اور بدشکل تھے چنانچہ ان کی بیوی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خدا کی قسم اگر خوفِ خدا دامنگیر نہ ہوتا، تو جب وہ میرے پاس آیا تھا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم اس کا باغ واپس کر دو گی۔ عرض کیا ہاں۔ چنانچہ اس نے انہیں ان کا باغ واپس کر دیا اور حضورؐ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔

ان احادیث سے یہ باتیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) حضور صلعم نے عورتوں کی شکایت ہی کو کافی سمجھا۔ خاوند سے کچھ بھی نہیں پوچھا گیا۔ یہاں تک کہ آپ نے یہ تک دریافت نہ کیا کہ ھل انت کارھہا کما کرھتک ام لا[3] کہ کیا تو بھی اسے ناپسند

---

[1] بخاری مع فتح الباری۔ جلد ۱۱ ۔ صفحہ ۳۱۹ ، [2] سنن ابن ماجہ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۶۶۳

[3] فتح الباری شرح بخاری۔ جلد ۱۱ صفحہ ۳۲۲۔

کرتا ہے جیسے وہ تجھے ناپسند کرتی ہے۔

(۲) عورتوں نے ناپسندی کی جو وجہ بیان کی ان کا کوئی مزید کھوج نہیں لگایا گیا۔ ان کا صرف بیان تسلیم کر لیا گیا۔

(۳) حضور صلعم نے عورتوں کے اپنے فیصلہ کو نافذ کر دیا۔ انہیں کوئی اخلاقیات کا درس دینے کی بھی کوشش نہیں کی۔

ان حقائق سے بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلعم کا یہ عمل' حکومت کی طرف سے ان عورتوں کے اپنے فیصلہ کا نفاذ تھا۔ اس سے یہ واضح ہے کہ عورت پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خاوند سے اپنی نفرت کے اسباب و وجوہ عدالت کے سامنے لائے اور عدالت اپنا اطمینان کرے کہ وہ وجوہات درست ہیں یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ عدالت کا یہ کام ہے کہ وہ اس امر کی تسلی کر لے کہ عورت اس قسم کا بیان برضا و رغبت دے رہی ہے، کسی کے مجبور کرنے سے نہیں دے رہی۔ جہاں تک "باغ واپس دینے" کا تعلق ہے' اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

(۵)

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد یا عورت ہنگامی طور پر اشتعال میں آکر علیحدہ ہو جانے کا ارادہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے قرآن مجید نے تجویز کیا ہے کہ ایسی صورتوں میں' معاملہ مرد اور عورت تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ کسی ثالث کا درمیان میں آکر مصالحت کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے اس نے کہا ہے کہ ایک نمائندہ عورت کے خاندان سے اور ایک خاوند کے خاندان سے مل کر' بورڈ کی شکل میں مصالحت کی کوشش کریں (۴/۳۵)۔ واضح رہے کہ اس بورڈ کا کام' باہمی مصالحت کی کوشش ہوگی۔ یہ مرد یا عورت کے فیصلہ پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوں گے۔ فیصلہ بہرحال' مرد یا عورت کا اپنا ہوگا اور اگر یہ بورڈ اپنی مصالحت کی کوششوں میں ناکام رہ جائے تو (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) مرد یا عورت کا فیصلہ نافذ ہو جائیگا۔ یہی طریق مسنون بھی ہے۔ چنانچہ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۹۲ پر لکھا ہے

فاذا حدث بین الزوجین شقاق فمن السنة ان یتوسط بینهما من یستطیع التاثیر علیهما من اهلهما۔ فان عجزوا عن الاصلاح و اشتد الشقاق الی درجة یخشی معها الخروج عن حدود اللہ تعالٰی فان فی هذه الحالة یصح المفارقة بعوض او بغیر عوض۔

اگر زوجین کے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو سنت طریقہ یہ ہے کہ ان کے خاندان سے ان پر

اثر رکھنے والا کوئی شخص اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرے۔ لیکن جب یہ اصلاح کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں اور جھگڑا اس حد تک طول پکڑ جائے کہ حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خدشہ ہو تو پھر اس صورت میں زوجین کی جدائی ہی بہتر ہے چاہے وہ معاوضے کے بدلے میں ہو یا بغیر معاوضہ کے ہو۔

اب لیجئے "معاوضہ" کا سوال۔ نکاح کے وقت مرد کی طرف سے عورت کو مہر دیا جاتا ہے۔ یہ تو فرض ہے۔ ہو سکتا ہے (اور عام معاشرہ کا رواج بھی ہے کہ) مہر کے علاوہ عورت کو کچھ اور بھی دیا جائے۔ مرد کو عورت کی طرف سے کچھ نہیں دیا جاتا۔ (جہیز تو محض ہماری رسم ہے)

اب ایسی صورت پیدا ہو سکتی تھی کہ عورت اپنے حق طلاق کا غلط استعمال کر کے نکاح کے دو چار روز بعد بنا بر کراہت مقدسے آزاد ہو جانا چاہے۔ اس کی طرف سے اظہار کراہت کے بعد عدالت اسے زبردستی اسکے خاوند کے نکاح میں تو نہیں رکھ سکتی، البتہ مرد نے جو کچھ عورت کو دیا تھا اسے (کلیتہً یا جزوًا) واپس دلا سکتی ہے۔ ($\frac{۲}{۲۲۹}$)۔ رسول اللہ نے جناب ثابتؓ کے جو باغ واپس دلائے تھے تو وہ اسی ارشاد خداوندی کی تعمیل میں تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عدالت کا فریضہ صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ متعین کرے کہ مرد کو کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے یا نہیں۔ اور اگر ملنا چاہیئے تو کس قدر۔

اگر مرد خود معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنا چاہے تو پھر اسے معاوضہ دلانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ خواہ قرآن کے الفاظ میں، وہ سونے کا ڈھیر ہی کیوں نہ ہو جو اس نے عورت کو دیا تھا۔ ($\frac{۴}{۲۰}$)

ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی تھی کہ مرد اس معاہدہ کو توڑنا تو خود چاہے لیکن نیت یہ رکھے کہ اس کی تحریک عورت کی طرف سے ہو تاکہ وہ عدالت سے کچھ معاوضہ لے سکے۔ قرآن مجید نے اسے سختی سے روک دیا۔ اور کہہ دیا کہ تمہارے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کو تنگ کر کے روک رکھو تاکہ اس طرح تم ان سے معاوضہ حاصل کر سکو۔ ($\frac{۴}{۱۹}$)

البتہ عورت سے اگر کوئی بے حیائی کی بات سرزد ہو اور اس پر مرد تنسیخ نکاح کا فیصلہ کرے تو پھر عدالت اسے کچھ معاوضہ دلا سکتی ہے۔ ($\frac{۴}{۱۹}$)

قرآن مجید میں مرد یا عورت کی طرف سے تنسیخ نکاح کی تحریک کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال نہیں کئے گئے۔ لیکن فقہ نے ان کے لئے الگ الگ اصطلاحات وضع کیں۔ چنانچہ کہا یہ گیا ہے کہ

الخلع نوع من الطلاق۔ لان الطلاق تارۃ یکون بدون عوض و تارۃ بعوض۔ و الثانی ھو الخلع۔

خلع طلاق ہی کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ بعض اوقات طلاق بغیر کسی معاوضہ کے ہوتی ہے اور

کبھی معاوضہ کے عوض۔ اور یہ دوسری قسم خلع کہلاتی ہے[1]۔

خُلع کی الگ اصطلاح تو یوں وضع ہوئی لیکن اس کے بعد جب ہمارے فقہی قوانین مرتب ہوئے تو ان میں مرد کو تو بغیر کسی قسم کی شرائط اور پابندیوں کے جب جی چاہے معاہدۂ نکاح فسخ کرنے کا حق دے دیا گیا اور عورت بیچاری کے حق خلع پر ایسی سخت پابندیاں عاید کی گئیں جن کی رُو سے وہ ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی رہ گئی جن کا ذکر، طلوع اسلام نے، انتہائی درد وسوز کے ساتھ اپنے باب المراسلات (اشاعت شدہ ماہ ستمبر ۱۹۶۸ء) میں کیا ہے کہیں یہ کہا گیا ہے کہ طلاق (یعنی معاہدہ نکاح کی تنسیخ) کا حق تو مرد اور صرف مرد کو حاصل ہے ہاں وہ اگر چاہے تو اپنے اس حق کو، بیوی کو بھی تفویض کر سکتا ہے:

کیا آپ نے کبھی اس قسم کے معاہدہ کا نام بھی سنا ہے کہ اسے استوار کرنے کے لئے تو فریقین میں سے ہر ایک کی رضامندی کی ضرورت ہو لیکن اُسے فسخ کرنے کا کلیتہً حق ایک فریق کو حاصل ہو اور دوسرا فریق اسے فسخ ہی نہ کر سکے۔

پھر، مرد تو جب جی چاہے، عدالت کی مداخلت کے بغیر، از خود، اس معاہدہ کو (طلاق طلاق طلاق) کہہ کر توڑ دے۔ لیکن اگر عورت اسے فسخ کرانا چاہے تو اُسے عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑے اور وہ بھی ایسی کڑی شرطوں کے ساتھ جن کا پورا کرنا اس بیچاری کے لئے از بس دشوار ہو۔

آپ سوچئے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام میں، کہیں بھی، مرد اور عورت کے ان اختیارات میں کسی قسم کی تفریق کی گئی ہے؟ اس امتیاز سے، عورت کیا پیدا ہو گئی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زبان سے سنیئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> اس افسوسناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۵۰ فیصدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصہ کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں[2]۔

عورت کے حق طلاق کو عملاً سلب کر لینے کے متعلق آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> خُلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانونِ اسلامی میں عورت اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خُلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا ہے اور اصولِ شرع کے خلاف خلع دینے یا نہ

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۹۳۔ [2] حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۹

دینے کو بالکل مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسولؐ کے قانون پر قطعاً نہیں۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں، بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے[1]

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

پس نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا تحقیق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو قطعی ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی[2]

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں اور یہ ایک معقول بات ہے[3]"

آگے چل کر اس قاعدہ کی مزید تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی کے لئے تنقیح طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالب خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اس لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدمات خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اول تو اس سوال کی کماحقہٗ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اُس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذواقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حق طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذواقیت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے عورت کے حق خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ ہونا چاہیئے[4]

مقام حیرت ہے کہ یہ حضرات ایک طرف تو عورت کے حقوق کی مدافعت میں اس قدر دل گرفتہ نظر آتے ہیں اور غیر اسلامی قوانین شریعت کی تبدیلی کے لئے اس قدر مضطرب دکھائی دیتے ہیں لیکن جب حکومت کی طرف سے

---

[1] حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۷۳-۷۴۔

[2] حقوق الزوجین صفحہ ۶۹ ۔ [3] ایضاً۔ صفحہ ۷۰۔ [4] ایضاً۔ صفحہ ۷۰-۷۱

اس سلسلہ میں ذرا اسی سلسلہ جنبانی (عائلی قوانین کی صورت میں) ہوتی ہے تو حکومت کے اس مستحسن اقدام کی سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ سیاست سے جکڑی بھی دنیا میں عجیب عجیب تماشے دکھاتی ہیں۔ ان کی اسی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ عائلی قوانین میں بھی اس مظلوم طبقہ کی دادرسی کے لئے کچھ نہ ہوسکا۔

بہرحال اب کرنے کا کام یہ ہے کہ جو حضرات اسلام اور انسانیت کے نام پر عورت کے ساتھ اس ناانصافی کو محسوس کرتے ہیں وہ آگے اس کے جائز قرآنی حقوق دلانے کے لئے جدوجہد کریں۔ اس باب میں طلوع اسلام مستحق صدمبارکباد ہے کہ اس نے شروع ہی سے ان بے سہارا طبقہ کی غمگساری اور ہمدردی میں خون کے آنسو بہائے ہیں اور اب پھر اسی جذبہ کو لے کر اس سوال کو سامنے لایا ہے۔ ضرورت ہے کہ طلوع اسلام کی اس جدوجہد میں اس سے پورا پورا تعاون کیا جائے۔ کرنے کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے مروجہ غیر اسلامی قوانین میں قرآن اور سنت کے مطابق ترمیم کی جائے جس کی رو سے واضح الفاظ میں طے پائے کہ

(۱) معاہدہ نکاح کے فسخ کرنے کا عورت کو اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو۔ جس طرح اپنے نکاح کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق مرد کو حاصل ہے اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس معاہدہ کے فسخ کرنے کا فیصلہ عورت کو از خود کر لینا چاہیئے۔ اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں۔

(۲) ثالثی بورڈ صرف مصالحت کی کوشش کرے۔ یا اس امر کا اطمینان کرے کہ عورت نے برضا و رغبت فسخ نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔ اسے یا کسی اور ادارہ کو اس کا قطعاً حق حاصل نہ ہو کہ وہ فیصلہ کرے کہ عورت کے دل میں واقعی خاوند کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ جن امور کا تعلق انسان کے قلب سے ہو اس کا فیصلہ کوئی دوسرا شخص کس طرح کر سکتا ہے۔

(۳) عورت کے اس فیصلہ کے بعد ثالثی بورڈ یا عدالت صرف یہ فیصلہ کرے کہ مرد کو کچھ معاوضہ دلایا جائے۔ اور اگر دلایا جائے تو کس قدر۔ اس بات کا عورت کے فسخ نکاح کے فیصلہ پر کوئی اثر نہ ہو۔

اس قسم کا قانون خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے عین مطابق ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ چیز سلف صالحین میں سے بھی اکثر کے مسلک کے مطابق ہوگی۔ اس سلسلہ میں قاضی ابوبکر جصاص لکھتے ہیں۔

قال ابوحنیفۃ و ابو یوسف و محمد و زفر و مالک والحسن بن صالح، والشافعی، یجوز الخلع بغیر سلطان و روی مثلہ عن عمر و عثمان و ابن عمر رضی اللہ عنہم[1]

---

[1] احکام القرآن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۲۵

امام ابوحنیفہ - امام ابو یوسف - امام محمد - امام زفر - امام مالک - حسن بن صالح اور امام شافعی
کے نزدیک خلع حکومت کی مداخلت کے بغیر جائز ہے۔ اور یہی مسلک حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ
اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت کیا گیا ہے۔

بعض فقہا نے اس میں عند المصالحت ثالثی بورڈ کی مداخلت کی بھی شرط عاید کی ہے۔ انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ وھل للحکمین الحق فی التطلیق اذا تعینت المصلحۃ۔ یعنی اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو کیا حکمین کو معاہدہ نکاح فسخ کرنے کا حق ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔ الجواب۔ نعم۔ اس کا جواب ہاں میں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ۴ صفحہ ۴۹۲) لیکن ہمارے نزدیک اس سے یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ مرد یا عورت کی طرف سے فسخ نکاح کے فیصلہ کا نفاذ ثالثی بورڈ کی مصالحانہ کوشش کی ناکامی کے بعد کیا جائے۔ یہ نہیں کہ ثالثی بورڈ اس امر کا فیصلہ کرے کہ یہ معاہدہ منسوخ ہونا چاہیئے یا نہ۔ اس لئے کہ قرآن مجید کی رو سے ثالثی بورڈ کا فریضہ صرف زوجین کی مصالحت کے لئے کوشش کرنا ہے نہ کہ یہ فیصلہ کرنا کہ معاہدہ نکاح منسوخ کیا جائے یا نہ۔ اس کا فیصلہ مرد یا عورت کی طرف سے ہوگا اور اس فیصلہ کو کوئی مسترد نہیں کر سکے گا۔ مرد کی طرف سے طلاق کے لئے یہی صورت اس وقت بھی ہے۔ اس کا حق طلاق حکمین کی مرضی پر موقوف نہیں۔ یہی شکل عورت کے لئے بھی ہونی چاہیئے۔

جب تک اس قسم کا قانون مرتب نہیں ہوتا عورتوں کے مصائب کا حل نہیں مل سکتا۔ اس وقت سینکڑوں گھرانے محض اس قسم کے قانون کے نہ ہونے کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔

کیا ہم توقع کریں کہ ملک کا اسلام دوست' انصاف پرور' دردمند طبقہ اس قسم کا قانون مرتب کرانے کے لئے کوشش کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت اور دنیا کے سامنے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پیش کرنے کی قابل قدر کوشش ہوگی۔ والسلام!

طلوعِ اسلام کا اگلا شمارہ

کنونشن نمبر ہوگا

اس میں ناظم ادارہ کی رپورٹ کے علاوہ خطابات اور مذاکرہ کے منتخب مقالات درج ہونگے۔ اگر بزموں کو یا ایجنٹ حضرات کو اس شمارہ کی زاید کاپیاں مطلوب ہوں تو اس کی بابت ۱۵ نومبر تک اطلاع دے دیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

نقد و نظر

لاہور کی دہلیز پر

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ تاریخ' قوم کا حافظہ ہوتی ہے۔ جس طرح ایک فرد کے حافظہ کے گم ہو جانے سے اس فرد کی شخصیت محو ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ باقی نہ رہے تو اسکی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہماری ملی تاریخ کا بابِ نو، تشکیلِ پاکستان سے شروع ہوتا ہے اور اس میں سب سے اہم واقعہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے۔ لیکن حقیقتہً باعثِ صد تاسف ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں 'تحریکِ پاکستان کی کوئی قابلِ اعتماد تاریخ نہیں۔ اسی طرح 'جنگِ ستمبر کی بھی کوئی اطمینان بخش تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ اگر صورتِ حال یہی رہی تو ڈر ہے کہ ہماری حیاتِ اجتماعیہ کا یہ عظیم واقعہ آنے والی نسلوں کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو جائے گا۔

بارے غنیمت ہے کہ اس باب میں کچھ انفرادی کوششیں جاری ہیں اور ان میں سرفہرست عنایت اللہ صاحب کا نام آتا ہے۔ انہوں نے تو یوں سمجھئے گویا' اس جنگ کی وقائع نگاری کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس ہونہار فرزندِ ملت کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے۔ زیرِ تبصرہ کتاب' اسی سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ہے۔ اس میں انہوں نے، 'پاک فوج کی ایک بٹالین۔ سولہ پنجاب رجمنٹ کی اے اور بی کمپنی اور بٹالین ہیڈ کوارٹر کے ان تین سو بیس جوانوں کی جرأت و بسالت کی داستانِ حریت بیان کی ہے جنہوں نے نہر سے اُس پار سترہ روز تک دشمن کے ہراول لشکر کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا جس کی مثال، جنگ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عنایت صاحب نے ان مجاہدین کے کوائف جمع کرنے میں جس محنت و کاوش، اور پھر انہیں پیش کرنے میں جس حسنِ نگارش سے کام لیا ہے' یہ انہی کا حصہ ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب ایسی ہے جس کا ایک ایک نسخہ ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اس وقت پاکستان میں جو ہمارا سب کچھ محفوظ ہے وہ کن جاں نثاروں کی بے لوث قربانیوں کا رہینِ منت ہے۔ کتاب کا پیش لفظ میجر جنرل سرفراز خان نے لکھا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ (کم از کم) اس محاذ پر تبصرہ نگاری کیلئے ان سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

کتاب' سفید کاغذ پر عمدگی سے چھاپی گئی ہے۔ اور چھ روپے میں، مکتبہ داستان ۵۷ شارع فاطمہ جناح لاہور سے مل سکتی ہے۔

(پش)

بقیہ روشنیاں اور... صفحہ ۲۲ سے مسلسل

ضابطۂ حیات "قرآن" ہے۔ اور تحریک کے نزدیک زندگی نام ہے آرزو اور امید کا۔ مایوسی اور حزن اہلیسیت کے پھندے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ قرآن کا اصل مقام امت نے قائم نہیں رکھا۔ یہ ایک وجہ پریشان فکری اور فرقہ بندی کو عروج ہوا۔ لہٰذا اب اس کا علاج صرف "خالص قرآن" ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب کبھی اسٹیج پر کسی قدآور شخصیت کا انتظار ہو تو سامعین کو اشتیاق ہوتا ہے کہ وہ جلد سے جلد اس عظیم شخصیت کے خطاب کو سنیں۔ اسی طرح اس محفل میں بھی لوگ محترم پرویز صاحب کے خطاب کو سننے کے لئے بیتاب و بیقرار ہو رہے تھے۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ مفکرِ قرآن مسکراتے ہوئے اسٹیج پر آتے اور پنڈال جوشِ عشق و محبت کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ مفکرِ قرآن کے اس خطاب کا موضوع تھا ـــ "عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا" ـــ پنڈال اپنی تنگ دامانی پر شکوہ سنج تھا۔ اور لوگ پنڈال سے باہر کھڑے ہوئے بانس کی طرح کھڑے تھے۔ اور یہ کیفیت اُن کی سنجیدہ فکری کا پتہ دے رہی تھی ـــ پرویز صاحب نے ایک ایک کر کے ان عالمگیر افسانوں کو چھیڑا جو ہمارے ملک میں عقاید اور ایمانیات کے جزو لاینفک سے بنے ہوتے ہیں۔ عام طور پر عقاید کے خلاف بات سننے پر جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ لیکن محترم پرویز صاحب کا حسنِ استدلال ایک گہری خاموشی پیدا کر رہا تھا اور کیا مجال جو کسی نے سر بھی کھجایا ہو۔ مفکرِ قرآن نے فرمایا کہ عہدِ طفولیت سے ہی انسان کے ذہن کو افسانوی رنگت سے نواز دیا جاتا ہے۔ اور ایک بچہ نانی اماں کی جنات کی کہانیوں کو شہزادوں اور پریوں کی بے بنیاد داستانوں کو زیادہ دلچسپی اور دلجمعی سے سنتا ہے اور ہر رات نت نئی کہانی سننے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی نفسیاتی کیفیت آئندہ زندگی میں بھی رہتی ہے اور یہی پریاں اور شہزادوں کے روپ بدل کر عقاید اور ایمانیات کی شکل میں ذہنوں میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر ذہن زندگی کے تلخ حقائق کا سنجیدگی اور علمی انداز سے جائزہ نہیں لے سکتا ـــ غلط معتقدات کی فہرست طویل تھی۔ لیکن مفکرِ قرآن نے اُن میں چند ایک کو لیا جنہوں نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے "انسان" کے بارے میں کہا کہ "عورت" ایک انسان ہے۔ لیکن اسے زندگی کے ہر میدان میں ایک "ضروری گناہ" کی حیثیت دے دی گئی ـــ اس طرح انہوں نے ہر افسانے کا تاریخی اور علمی جائزہ لے کر بتایا کہ یہ عقاید انسانیت کے لئے کس قدر مہلک اور مضرت رساں ہیں۔ اسی طرح انہوں نے "دنیا قابلِ نفرت ہے" "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" "انسان کی ایک فطرت ہے" "انسان کا ایک ضمیر ہے" "ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے" "جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے" "امیری غریبی سب خدا کے ہاتھ میں ہے" "مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کا افسانہ" اور انسانیت کے لئے سب سے زیادہ نقصان مقدس افسانہ "تصوف" کے بارے میں اصل حقائق سے نقاب کشائی فرما کر دلوں کو سکون و اطمینان بخشا۔ مفکرِ قرآن کے اندازِ تکلم اور طرزِ استدلال نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں قلوب میں ایمان و ایقان کی شمعیں روشن کر دیں۔ آخر میں انہوں نے بتایا کہ "نانی اماں کے افسانوں سے توجہ محوِ خواب ہو جاتا ہے لیکن میرے بیان کردہ افسانے

صاحبِ احساس کی راتوں کی نیند کو ختم کر دیں گے۔" مفکرِ قرآن مصروفِ کلام تھے کہ میرے کان نے ایک تھرتھراتی آواز۔ "رب ایسی مولوی، نوں خوش رکھے۔" (واللہ اس مفکر کو خوش رکھے) سُنی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک دیہاتی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس طرح یہ اجلاس ختم ہو گیا۔ (چونکہ پرویز صاحب کا یہ نہایت بلند پایہ خطاب بعد میں شائع ہو جائے گا اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں)

(۷)

محترم پرویز صاحب کا الوداعی خطاب

۱۳؍ اکتوبر۔　　　بروز اتوار　　　بوقت ۱۲ بجے بعد دوپہر

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی!

چار دن ہمہ تن مصروف رہنے کے بعد آج وہ لمحات بھی آ پہنچے جو یہ تلخ احساس دلا رہے تھے کہ اب ہم جدا ہو جائیں گے۔ لیکن دلوں کی دوریاں نہیں بلکہ فاصلوں کی دوریاں ـــــ اس احساس کی فضا میں مفکرِ قرآن کپکپاتے ہونٹوں سے لب کشا ہوئے اور الوداعی داستانِ غم کو چار دنوں کے کیف و سرور کی کیفیات سے لبریز دل کے ساتھ، اس طرح بیان کیا کہ ؎

اُن کی پلکوں پر ستارے اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے!

مفکرِ قرآن نے آنسوؤں کو پلکوں میں خشک کرتے ہوئے، تھرتھراتی آواز میں فرمایا کہ آپ احباب نئے ولولے، نئے عزائم اور قرآنی جوش و خروش لے کر واپس منزلوں تک پہنچتے ہیں اور آپ کی رپورٹوں سے مجھے نئی زندگی مل جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کنونشن میں آپ احباب کے عزائم نے مجھے جینے کا سہارا دیا ہے اور میری آئندہ یعنی تعلیمی درسگاہ کے قیام کی عظیم ذمہ داری کو آپ احباب نے کمال ایثار سے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے۔ آپ بنیاد کی اینٹ رکھیئے، ان شاء اللہ تا بہ فلک بلند عمارت بتدریج کھڑی ہو جائیگی۔ اللہ آپ کے عزائم کو پورا کرے۔ انہوں نے کہا کہ میرے عزیز آپ ہیں، میرے رشتہ دار آپ، میرے پڑوسی آپ اور میری زندگی بڑھانے کا سامان، آپ کا عمل پیہم ہے ـــــ! آنسوؤں کی چمک، دلوں کا گداز، نگاہوں کا جوش، اس الوداعی محفل کی فضا میں حلول کر گیا تھا کہ الوداع کہنے والے نے اس فضا میں اس شعر کو دہرایا کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اس طرح یہ گیارہ مہینے کے بعد آنے والی عید منائی گئی ـــــ فالحمد للہ علیٰ ذالک!

قرآنی دعوتِ فکر کے چند اہم شاہکار

۱۔ لغات القرآن یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے عمل کو کیا حیثیت دی ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم عاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟ یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشی معاشرتی سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ (حبیب ایڈیشن)۔ چار روپے

۳۔ سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول آٹھ روپے۔ حصہ دوم سوم چھ چھ روپے

۴۔ نظامِ ربوبیت نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ یقیناً ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

۵۔ قرآنی فیصلے اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دورِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت (قسم اعلیٰ) مجلد۔ نو روپے۔ قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶۔ مقامِ حدیث وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر چھائے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے؟ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۱۰/- روپے

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن میں خطاب:

طلوعِ اسلام نے کیا کیا ہے؟

محترم سید حسن عباس رضوی ——— بزمِ طلوعِ اسلام کوئٹہ

صاحبِ صدر، معزز حاضرین و حاضرات! سلام و رحمت۔

آغازِ کلام یوں تو اس سوال کا جواب بڑا ہی مختصر ہے کہ طلوعِ اسلام نے کیا کیا ہے۔ وہ یہ کہ طلوعِ اسلام نے مختلف مذاہب کی ٹوٹی پھوٹی صراحیوں کی ٹھیکریاں جمع کر کے ان پر لکھی ہوئی داستان پارینہ کو ازسرِنو مرتب کیا ہے۔ دنیائے انسانیت کو وہ فکرِ صالح عطا کی ہے جس سے بیگانہ ہو کر وہ جہالت کی تاریکی میں دم توڑ رہی تھی۔ کاروانِ حیات کو منزل کی طرف بڑھنے کے لئے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کر دی ہے۔ ایک متعین اور واضح نصب العین عطا کیا ہے۔ فلسفۂ حیات کا مکمل مفہوم پیش کیا ہے۔ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کے اسرار بے نقاب کر دیئے ہیں۔ اور مافیہا کا سینہ چاک کر کے رموزِ فطرت انسانیت کے سامنے بے مزد و معاوضہ پیش کر دیئے ہیں۔

لیکن اگر تفصیلاً بیان کیا جائے کہ طلوعِ اسلام نے کیا کیا ہے، تو اس کے لئے ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ میں چند ایک ایسی چیزوں پر اکتفا کروں گا جو مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔

سب سے پہلی انقلابی دعوت طلوعِ اسلام نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین یعنی نظامِ حیات (SOCIAL ORDER) ہے جس کے بنیادی اصولوں اور ہدایات کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ جسے اپنا کر انسان جنت کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے دین ہی حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملا تھا۔ دین انسان کی حیثیتِ اجتماعیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب ذاتی عقائد اور رسم و رواج کا مجموعہ ہے۔ اس میں تفکر و تدبر کو کوئی دخل نہیں۔ اس کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ یہ انسانیت کے جسدِ واحد کا شیرازہ بکھیر دیتا ہے۔ یہی وہ

مقام ہے جہاں انسان ایک ایسی دنیا میں داخل ہوتا ہے جہاں سلامتی اور امن کا چراغ گُل ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا ہے۔ فسادِ آدمیت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جدھر نگاہ دوڑائیں دنیا رزمگاہ ابلیس نظر آتی ہے۔ پھر یہیں سے مذہبی پیشوائیت جنم لیتی ہے اور مجبور و مقہور انسان کو طرح طرح کے فریب دے کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہے۔ وہ اپنی بقاء کے لئے محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جاتا ہے اور یہ اُن کی کمائی پر عیش اڑاتی ہے۔ ایسی زندگی کو قرآن نے دوزخ کی زندگی کہا ہے۔

برادرانِ عزیز! آپ نے دین اور مذہب کا تقابل دیکھ لیا۔ جب تک دینِ خداوندی کی عطا کردہ اقدار کی پیروی ہوتی رہی، انسان پر ابرِ رحمت کی گہربار یاں ہوتی رہیں۔ اور جونہی انسان نے دینِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے کردار کو خود ساختہ پیمانوں کے تابع کر کے ہیئتِ اجتماعیہ کا شیرازہ بکھیر دیا تو تمام افرادِ خاندان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور چار و نطرف فساد اور خوں ریزی برپا ہو گئی اور اس طرح شرفِ انسانیت مذہب کی بھینٹ چڑھ گئی

مسلمانوں کی حالتِ زار

عام انسانوں سے ہٹ کر اب عالمِ اسلام کی طرف آیئے۔ اس ملت نے بھی جب دین کو چھوڑ کر مذہب اختیار کیا اس سے وہ تمام سرفرازیاں اور نعمتیں چھن گئیں جو مسلمانوں کا طغرۂ امتیاز تھیں۔ اس کی اجتماعی زندگی پارہ پارہ ہو گئی۔ ابلیسیت نے پھر سر اٹھایا۔ وہی ابلیسیت جو نورِ مبین آجانے پر صحراؤں، جنگلوں اور غاروں میں جا چھپی تھی۔ کہیں شاہی درباروں میں عشوہ طراز ہوئی، کہیں جبہ و عمامہ میں جلوہ افروز ہوئی اور کہیں مقدس مقامات میں نمودار ہوئی۔ یہاں تک کہ پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آ گئی۔ وہی دیرینہ اسباق سامری ایک ایک کر کے سامنے آتے چلے گئے اور اپنے مخصوص سحر کارانہ انداز سے معاشرتی نظام میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس طرح ہوائے شیطنت ڈگمگاتی ہوئی کشتیوں کو ڈبوتی رہی۔ قلزمِ طاغوت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجِ جہانبانی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا اور خیر الامم آسودہ ساحل ہو کر دل کو یہ تسلیاں دیتی رہی کہ یہ میری نہیں کسی اور کی کہانی ہے۔ وہ قیامت کے مسائل حل کرتی رہی۔ لیکن اُسے یہ قیامت دکھائی نہ دی کہ

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

اور ایک وقت ایسا آیا کہ اُس کی سطوت و جبروت کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں۔ اس کے بعد مسلمان تذبذب اور بد دلی کے عالم میں مارا مارا پھرتا رہا۔ زمین اس پر تنگ ہو گئی۔ اُس کے لئے ایک لمحہ سستانے کے لئے بھی ٹھکانہ نہ رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر کوئی بھیڑ بکری کی طرح اُسے جس طرف چاہتا ہنکا لے جاتا۔ اس محرومی اور ناکامی کی حالت میں مسلمان دربدر خاک بسر پھر رہا تھا۔ ندرتِ فکر اور جدتِ کردار جیسی متاعِ بے بہا اُس سے چھن چکی تھی۔ اُسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ اُسے اس گرداب بلا سے نکالنے والا کوئی دکھائی نہیں

دیتا تھا۔ سے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہداں کے لئے

مردِ راہداں

آخر کار مبدائے فیض کی کرم گستری سے اُنہی میں سے ایک مردِ راہداں پیدا ہوا جسے اہلِ فکر پرویز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہا جائے گا کہ پرویز بھی ایک مفکر ہے اور دوسری تحریکوں کے سربراہ بھی مفکر ہیں۔ آخر اس میں کیا خاص بات ہے۔ وہ خاص بات یہ ہے کہ پرویز کی فکر قرآن حکیم کے خالص چشمۂ نور سے منور اور مستنیر ہے۔ محترم پرویز صاحب نے جو فکر پیش کی ہے وہ بالکل منفرد کیفیت کی حامل ہے۔ اس کا ثبوت اہلِ جبہ و عمامہ کی غوغا آرائی سے ملتا ہے۔

دوسری انقلابی دعوت

دماغ میں فکرِ بلند کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے پرویز صاحب کے سینے میں قلبِ حساس بھی رکھا ہے۔ یہی وہ قلبِ حساس ہے جس نے ملّت کی محرومی کی المناک داستان اور مسلسل ناکامی کی وجہ سے ان کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تاریخِ انسانیت پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ان کے سامنے انسان کے کمال و زوال کے تمام واقعات سینما فلم کی طرح ایک ایک کر کے آتے گئے۔

اب اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ملّتِ اسلامیہ کے زوال کا سبب کیا ہے۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ قرآنی بصیرت کی بدولت اس مردِ دور بین کی نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ ملّت کا مرض قرآن کی رفاقت سے محرومی ہے۔ اس کا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اُس کا مرکز چھن گیا ہے۔ وہ شجرِ ممنوعہ کی طرح ایک سو ایک شاخوں میں بٹ چکی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عبادت کا مفہوم بدل گیا ہے۔ مذہبی پیشوائیت، ملوکیت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو چکی ہے۔ جب مرض کی علّت اور علامات معلوم ہو گئیں تو علاج بھی سامنے نظر آنے لگا۔ انہوں نے دیکھا نہ یہ مرض نیا ہے نہ اُس کے لئے کسی نئے علاج کی ضرورت ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

محترم پرویز صاحب نے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی اور لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ بیماری قرآن سے دوری کی ہے اور علاج "تمسک بالقرآن"۔

دین کے نفاذ کیلئے خطۂ ارض کی ضرورت لاینفک ہے

برادرانِ عزیز! "الدین" یعنی اسلامی نظامِ حیات کا ضابطۂ قوانین، یعنی قرآن تو موجود تھا مگر اس نظام کی اہم کڑی جس کے بغیر تمسک بالقرآن کا عمل (PROCESS) تکمیل نہیں پا سکتا موجود نہیں تھی۔ یہ اہم

کڑی قوتِ نافذہ یعنی مرکزِ ملت تھی۔ قوتِ نافذہ نہ ہو تو قانون نافذ نہیں ہو سکتا لیکن قانون اور قوتِ نافذہ کے ساتھ خطۂ ارض کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جہاں یہ قانون نافذ کیا جائے۔ اُممِ سابقہ کی تاریخ جو قرآن میں محفوظ ہے ہمیں بتاتی ہے کہ نظامِ خداوندی کے نفاذ کے لئے ہر نبی کے پیشِ نظر خطۂ ارض کی ضرورت لاینفک رہی ہے۔ حضرت موسیٰ کی صحرا نوردیاں اور ان کی تلاطم خیز داستانِ جہاد شاہد ہے کہ وہ ایک ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں وقفِ اضطراب ہے جہاں بنی اسرائیل کو آباد کیا جائے اور وہاں پھر وہ نظام قائم کیا جائے جس کے لئے اللہ نے ان کو مامور کیا تھا۔ یعنی لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (۲۰/۱۵) ہر فرد اپنی محنت کے بھرپور نتائج حاصل کر سکے اور کوئی آدمی اپنی محنت کے پھل سے محروم نہ رہے۔

نظریۂ پاکستان

یہ وہ ضرورت تھی جس کا احساس سر سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کو ایک عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ اور جس کی آرزو کی تکمیل کے لئے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے الٰہ آباد مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک خطبہ کے دوران پاکستان کا منصوبہ پیش کر دیا تھا۔ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے اقبال کی جوہر شناس نگاہ نے قائدِ اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ کا انتخاب کر لیا تھا۔ نظریۂ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں کے علاوہ نیشنلسٹ مسلمان اور علماء بھی میدان میں نکل آئے تھے۔ اس وقت ایک ایسے مفکرِ قرآن کی ضرورت تھی جو نیشنلسٹ علماء کو قرآن کی روشنی میں مسکت جواب دے سکے۔ فطرت کی طرف سے یہ فریضہ پرویز صاحب کے سپرد ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں قائدِ اعظمؒ نے سر سید اور شاعرِ مشرق کے حسین خواب کی تعبیر پیش کرنے کے لئے پاکستان کی تحریک چلائی اور اس تحریک کی ہمنوائی میں پرویز صاحب نے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے اجراء کیساتھ تحریکِ طلوعِ اسلام کا باقاعدہ آغاز کیا۔

عزیزانِ گرامی! وہ کتنا مبارک اور حسین منظر تھا جب یہ دونوں تحریکیں دینِ خداوندی کے غلبہ کی خاطر پہلو بہ پہلو منزل کی طرف گامزن ہوئیں۔ ان حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو تحریکِ پاکستان کے اصل محرک سر سید احمد خانؒ حضرت علامہ اقبالؒ، حضرت قائدِ اعظمؒ اور محترم پرویز ہیں۔ طلوعِ اسلام کا پہلا دور قیامِ پاکستان پر منتج ہوا۔

دوسرا دور پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور سعی و کاوش کا متقاضی تھا کیونکہ خطۂ زمین تو مل گیا تھا لیکن اس قانون، اس نظام کا نفاذ ہنوز باقی تھا جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اس میں قانونِ خداوندی کا نفاذ اور غلبہ ہی ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے پرویز صاحب کو علامہ اقبالؒ کی راہنمائی کے مطابق حضرت قائدِ اعظمؒ کے ساتھ اشتراک پر آمادہ کیا تھا۔ ورنہ طلوعِ اسلام کو نہ تو مذہبی فرقہ بننا مقصود تھا اور نہ سیاسی جماعت۔ طلوعِ اسلام کے سامنے نہ کوئی ذاتی مفاد تھا نہ ہوسِ اقتدار۔ اس کے پیشِ نظر صرف اسلامی نظام کا نفاذ تھا جس کے ذریعے اقتدار کو خدا اور خدا کے قانون کے لئے مخصوص کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔

تیسری انقلابی دعوت

برادرانِ عزیز! تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں مقابلہ نظامہائے حیات کے مابین ہوتا ہے نہ کہ ذاتی عقائد اور مذاہب کے درمیان۔ جو نظام امنِ عالم اور سلامتی کی ضمانت دیتا ہے دنیا اُس کی طرف جھکتی ہے۔ آپ کے عقاید بظاہر کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں جب تک آپ کے پاس انسان کی خوشحالی کے لئے ٹھوس نظام نہیں ہوگا، آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جس نے افراد کی ضرورت سے چشم پوشی کی، وہ نظام کبھی نہیں چل سکا۔ اور ظاہر ہے یہ مقاصد اُسی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں جب کسی ملک میں رزق کی فراوانی ہوگی۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے طلوعِ اسلام اس شد و مد سے پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کوئی ملک ہو، کوئی بھی نظام ہو، اس کے امن اور سلامتی کا راز اُس کی معیشت کے استحکام میں مضمر ہے۔ اُس کی خوشحالی کا دار و مدار اُس کی معاشی حالت پر ہے۔ اُس کے باشندوں کی نشو و نما کا انحصار اُس ملک کی معاشیات پر ہے اور معاشیات کا انحصار ملک کے ذرائع پیداوار پر ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں "خزائن الارض" پر ہے۔ اور خزائن الارض سے پورا پورا فائدہ صرف اور صرف اُسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب وہ افراد کی بجائے "قرآنی نظام" کی تحویل میں ہوں تاکہ ہر فرد معاشرہ کو اُس کی ضرورت کے مطابق ہر چیز مرکز کی طرف سے ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے قرآنِ حکیم کے ان گوشوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کیا جن کا تعلق اسلامی نظامِ معیشت سے ہے۔ ان جواہر ریزوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بعنوان "نظامِ ربوبیت" میں محترم پرویز صاحب نے ایک واضح اور متعین پروگرام پیش کیا ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا عملی پروگرام اسی کتاب پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں نظامِ حیات کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اس مختصر سے وقت میں اُن کو کلیتہً تو نہیں دہرا سکتا البتہ ان کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

نظامِ ربوبیت میں کیا ہے

(۱) اس نظام کی رُو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جاتی ہے اور کوئی فردِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)

(۲) کوئی فرد بھوکا، ننگا، یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(۳) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت، علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا قیمت انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشا حصولِ علم کے علاوہ فرد کی ذات کا استحکام اور اُس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

(۹) یہ جمیعتہ عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے: قرآن کی رو سے، ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں، تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے۔ اور اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اس کو قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات تجویز کرتا ہے جو افراد کی معاشی ہمواری کا ضامن ہے، جو اس کا واحد حل یہ بتاتا ہے کہ تمام ذرائع آمدن و وسائل پیداوار اور رزق کے سرچشمے نظامِ اسلامی کی تحویل میں ہوں اور وہاں سے ہر چیز حسبِ ضرورت افرادِ معاشرہ میں مساویانہ تقسیم ہو۔ اس طرح کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو اور یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ایک انسان صحیح معنوں میں خدا کی محکومی اور فرمانبرداری اختیار کر سکتا ہے جس کے لئے اُس کو پیدا کیا گیا ہے۔

صبر و استقامت

لیکن پاکستان بننے کے ساتھ ہی، جیسا کہ ہوا کرتا ہے، ایسی جماعتیں بھی پاکستان میں آگھسیں جن کا کام حصولِ راہ بن کر اولادِ آدم کو بھٹکانا تھا۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ کہ پاکستان بننے کے ایک سال بعد قائداعظمؒ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اور اس نوزائیدہ پودے کو ابتدا ہی میں بادِ سموم کی مہلک آندھیوں سے سابقہ پڑ گیا۔ یعنی یکے بعد دیگرے ایسی حکومتیں آتی رہیں جن کے بنانے والوں کے پیشِ نظر ذاتی مفاد اور اقربا پروری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن

قیدِ قفس کے بعد کرے گا قیدِ گلستاں کون گوارا

اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

لیکن طلوعِ اسلام جس نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا، اپنی محنتوں کے ماحصل اور ملت کے مزرعِ شاداب کو اس طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ میدان میں نکل آیا تاکہ پھر سے عوام کو قرآن کے رموز و اسرار سے روشناس کرائے۔ اس مقصد کے تحت پاکستان میں اور پاکستان کے باہر غیر ممالک میں طلوعِ اسلام کی بزمیں قائم کی گئیں۔ تاکہ ان کی وساطت سے طلوعِ اسلام کی پیش کردہ فکر کو عام کیا جائے۔ علاوہ ازیں پرویز صاحب کی شبانہ روز محنت کی بدولت عوام کو ایسا لٹریچر ملتا رہا جس کے وہ صدیوں سے منتظر چلے آ رہے تھے۔ یعنی سلسلۂ معارف القرآن، مفہوم القرآن، لغات القرآن، سلیم کے نام خطوط، نظامِ ربوبیت اور وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہوتے رہنے والی کتب اور پمفلٹوں نے قوم کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونک دی۔ مذہبی پیشوائیت جو اکاس بیل کی طرح شجرِ ملت کو اپنے شکنجے میں لئے ہوئے تھی اس کے بل ڈھیلے پڑ گئے۔ جدت فکر اور جدتِ کردار سے مذہبی پیشوائیت نے جن کو خود ضبط کر رکھا تھا، عوام کو واپس ملنے لگی اور مسلمان ایک بار پھر تفکر و تدبر کی کشادہ شاہراہ پر دلجمعی سے گامزن ہو گیا۔ یہ قرآن کا

اعجاز تھا اور پرویز صاحب کا دردِ بھرا دل جو حقائق کو پا کر چُپ نہ رہ سکا۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

سلسلۂ نشرواشاعت کی انقلاب انگیز تازہ تصنیف (ISLAM: A CHALLENGE - TO RELIGION.) آپ کے سامنے آ رہی ہے جو پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا انمول شاہکار ہے۔ اس پر کچھ زیادہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، صرف اتنا ضرور کہوں گا ؎

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

حرفِ آخر طلوعِ اسلام کا پروگرام ہنگامے برپا کرنا نہیں۔ اس کے پیشِ نظر نہایت پُرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔ یہ نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے نہ سیاسی پارٹی۔ اور نہ ہی اس کا مقصد چندے جمع کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس سامان و ذرائع کی بے حد کمی ہے پھر بھی یہ اپنی منزل کی طرف بڑی سرعت سے بڑھتے چلا جا رہا ہے۔ طلوعِ اسلام کے لئے اس سے بڑھ کر اور زادِ راہ کیا ہو سکتا ہے کہ جب وہ دین کی آواز کو بلند کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کائناتی قوتیں اس کا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام کی آواز سننے پڑھنے والے کو متاثر کر دیتی ہے اور اس کو رُک رُک کر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کہیں یہ میرے ہی دل کی آواز تو نہیں۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ طلوعِ اسلام کے ہمنوا تو ایک طرف، اس تحریک کے شدید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں خیالات تو کجا، اصطلاحات، استعارات اور اکثر اوقات الفاظ تک بھی وہی استعمال کرتے ہیں جو طلوعِ اسلام نے قرآن پیش کرتے وقت استعمال کئے ہیں۔ کیا یہ انقلابِ عظیم نہیں ہے کہ ؎

حسن کے رازِ نہاں شرح و بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی آنکھ نے اُن سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

(پیغام)

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار کی صبح ۹ بجے — ان کے مکان واقع ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ — میں ہوتا ہے
خواتین کے لئے پردہ کا الگ انتظام ہوتا ہے۔

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔

عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

سلیم کے نام خطوط

جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور اچھا چھپا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد (پانچ روپے فی جلد)

عہد آفریں کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچاس روپے میں

بصیرت افروز کتابیں

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے) (سستا ایڈیشن - چار روپے)

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

معلومات افزا کتابیں

ناظم — ادارہ طلوع اسلام — ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves careful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs. 25.00 Paper back - Rs. 16.00

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,
25-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH
Chowk Urdu Bazar, LAHORE